جلد ۳۴	ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۴ء	عدد ۶

مضامین

شذرات

اسلامی ہند کی مکمل تاریخ،

ہندوستان مین مسلمانون کی آمد اور سلاطینِ اسلام کی بادشاہی وحکومت اور مسلمانون نے اس ملک کو جو ترقی دی اور یہان جو تمدن پیدا کیا ان سب کی ایک مفصل ومکمل اسلامی تاریخ کی ضرورت تاریخی، علمی، قومی، سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے، لیکن یہ کام اسقدر اہم ہے کہ اسکو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہین اس کے لیے دارالمصنفین پر پڑ رہی ہین، دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اسلئے پہلوتہی کی، کہ اس کیلئے گرانقدر مصارف کی ضرورت ہے جس کے لئے اسکا موجودہ سرمایہ کافی نہین، اس کام کیلئے اسکو جو ضرورت درپیش ہے اسکا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:

۱- تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخون کی فراہمی نقل اور ہوسکے تو خریداری،

۲- تاریخ ہند کی جو مطبوعہ کتابین ہمارے پاس نہین اُن کو حاصل کرنا،

۳- یورپین زبانون مین قدیم یورپین سیاحون نے مغلون کے عہد کے احوال لکھے ہین، یا آجکل انگریزی مین ہندوستان کی جو قابلِ ذکر تاریخین لکھی ہین، ان کو خرید کر یا ہدیہ لیکر حاصل کرنا،

۴- مرہٹون اور سکھون نے اپنے اپنے عہد کے جو تاریخی مواد فراہم کئے ہین، اُن کو جمع کرنا،

۵- مختلف کتبخانون مین ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو نادر قلمی کتابین موجود ہین، سفر کرکے اُن کا مطالعہ کرنا اور اُن سے معلومات فراہم کرنا،

۶- کتاب کی ترتیب وتدوین کے لئے چند لائق اشخاص کے خدمات کو مناسب معاوضہ پر حاصل کرنا،

۷- تیار شدہ جلدون کو چھاپکر شائع کرنا،

خیال ہے کہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کو پندرہ حصون مین تقسیم کیا جائے،

حصۂ اول، آغازِ اسلام سے غزنویون کی پیدائش تک،

حصۂ دوم، غزنویون کا عہد،

حصۂ سوم- غوریون سے لیکر حکومتِ غلامان کے خاتمہ تک،

حصۂ چہارم، خلجی وتغلق،

حصۂ پنجم، از آمدِ تیمور تا خاتمۂ خاندانِ لودھی،

حصۂ ششم، بابر سے خاندانِ سوری تک،

حصۂ ہفتم، ہمایون بار دوم سے جہانگیر تک،

حصۂ ہشتم، شاہجہان سے عالمگیر تک،

حصۂ نہم، بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ثانی تک،

حصۂ دہم، بہمنیہ وعادلشاہیہ وغیرہ سلاطینِ دکن،

حصۂ یازدہم، گجرات ومالوہ وخاندیس،

دوازدہم، کشمیر وملتان وسندھ،

سیزدہم، جونپور وبنگال ودیگر متفرقات،

چہاردہم، اسلامی ہند کا آخری دور نظامت حیدرآباد ومرشدآباد وعظیم آباد، واودھ وروہیلکھنڈ ومیسور وارکاٹ

پانزدہم، ہندوستان مین اسلامی تمدن کی تاریخ،

اگر ان پندرہ جلدون مین سے ہر جلد کی ترتیب وتالیف پر کم از کم پانچ سو اور چھپائی پر بھی اسیقدر لاگت کا تخمینہ کیا جائے تو پندرہ جلدون پر پندرہ ۱۵ ہزار سے کم خرچ نہ آئیگا، اور کتابون کی خریداری وبہم رسانی کا خرچ دو ہزار بھی رکھا جائے تو مجموعی سترہ ہزار روپیہ ہوتا ہے، ہماری قوم مین ایسے اربابِ ہمت موجود ہین جو اس عظیم الشان کام کے لئے سترہ ہزار یکمشت

دے سکتے ہین، اور ہم کو مشکلات اور زحمتون سے بچا کر دین کے ثواب کیساتھ دنیا کی ابدی شہرت وناموری کے مستحق ہو سکتے ہین، لیکن ایسے بلند پرواز عنقا کے انتظار مین ہم کام کو ملتوی کرنا نہین چاہتے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دینا چاہتے ہین،

اس وقت تک اس سلسلہ مین دو قومی محسنون نے اپنے چندون کا اعلان کیا ہے، نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شیروانی صدر نشین دار المصنفین نے ایک سال تک پچاس روپیہ ماہوار کا، اور جناب خان بہادر مولوی محمد حسین خانصاحب سابق ڈپٹی اکونٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا وسابق فینانس منسٹر رامپور نے پانچسو یکمشت کا وعدہ فرمایا ہے، اس کے بعد جو ارباب ہمت علم دوست ہماری امداد فرمائین گے، اُن کے نام بعد کو شائع کئے جائین گے،

اس وقت عام مسلمانون کی خدمت مین یہ گذارش ہے کہ وہ ہماری مدد حسب ذیل صورتون سے کر سکتے ہین،

۱- اسلامی ہند کی تاریخ کے کسی قلمی یا نایاب مطبوعہ نسخہ کی فراہمی،

۲- شاہی فرامین، یا قدیم خاندانی یادداشت وتحریر بہم پہنچانا،

۳- کوئی ماہوار یا یکمشت چندہ دینا،

ان تمام لوگون کو جو اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہون، اور کوئی مفید مشورہ دینا چاہتے ہون، ناظم دار المصنفین سے خط وکتابت کرنی چاہئے،

قومی اخبارات سے امید ہے کہ وہ اس تحریر کو اپنے کالمون مین نقل کر کے ہماری مدد کرینگے، اور اگر اسکی تائید مین لکھ سکیں تو مزید عنایت ہو،

سید سلیمان ندوی،

ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ

۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء

مقالات

اسلام اور تعیّن راہ کی کشمکش

از جناب محمد عزیر صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) رفیق دار المصنفین

مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو، کہ جسوقت تک اُن کے دل ایمان ویقین کے نور سے منور تھے، اُن کی ترقی کا قدم زمانہ کی نامساعدت اور مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی وسیع زمین مین بڑھتا ہی چلا گیا، اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی اُن کے سامنے سرنگون ہوجانا پڑا، لیکن جب اس نور کی روشنی پھیکی پڑنے لگی، اور ایمان ویقین کی جگہ ضعف عقائد اور تشکیک نے دلون مین راہ پانی شروع کی، تو وہ تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگے، اور خدا کی زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن کیلئے تنگ ہوگئی،

مسلمانون کی موجودہ زبون حالی کا واحد سبب اُن کے ایمان کی کمزوری ہو، لیکن یہ کمزوری پیدا کیونکر ہوئی؟ اس کمزوری کی بنیاد خود اُن کے "زمانہ عروج" مین پڑ چکی تھی، عہد سعادت نبویہ اور دور خلافت راشدہ کے بعد جب جمہوریہ اسلام نے ایک عظیم الشان سلطنت کا قالب اختیار کرلیا اور اس کا نظام حریت جو ان الحکم الا للہ کی بنیاد پر قائم تھا، انسانی پادشاہت اور شخصی سلطنت کی شکل مین تبدیل ہوگیا، تو مسلمانون کا اپنے مالک کے ساتھ وہ مخصوص رشتہ جو تمام دوسرے رشتون کو توڑ کر جوڑا گیا تھا، کمزور ہوگیا، اور ان کی پیشانیان جو پہلے صرف رب السموات والارض کے سامنے جھکتی تھین، پادشاہون کے دربارون مین زمین بوس نظر آنے لگین، یہ تو نہین ہوا کہ مسلمانون نے خدا کی پرستش چھوڑ کر تخت وتاج کی پرستش شروع کر دی، لیکن یہ ضرور ہوا کہ للّٰہیت کی وہ روح جو ان کے تمام افعال واعمال کی جان تھی بحیثیت ملی فنا ہوگئی، ان کی فتوحات کا سلسلہ اب بھی صدیون تک جاری رہا، لیکن پہلے وہ اس لئے لڑتے تھے کہ

خدا کا بول بالا ہو، اور اب اسلئے جنگ کرنے لگے کہ سلطان وقت کے مقبوضات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے، اونھون نے بڑی بڑی مملکتین فتح کین، اپنی تہذیب وتمدن، اور علوم وفنون کی روشنی سے تمام عالم کو منور کیا، اور ایسی عظیم الشان سلطنتین قائم کین، جنکی نظیر سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہو، دنیا ان کے اسی دور کو ان کے عروج وکمال کا دور قرار دیتی ہو، لیکن ہمارے نزدیک یہ عروج ہی اُن کے زوال کا پہلا قدم تھا، اسی عروج نے دنیوی جاہ وعظمت کا وہ جذبہ انکے اندر پیدا کر دیا جس نے تھوڑے ہی دنون مین نصب العین کی حیثیت حاصل کر لی، اور خدا کے وہ بندے جنکی حیات و ممات پہلے تمامتر اپنے خالق کیلئے تھی، اب مادی قوت واقتدار کے دلدادہ ہوگئے،

اس انقلاب حال کا سب سے زیادہ مہلک اثر یہ ہوا کہ دلوں سے اللہ کی خشیت ومحبت رخصت ہونے لگی، اور انکی جگہ تخت وتاج کا رعب اور قومی عظمت وحشمت سے وابستگی پیدا ہو گئی، مسلمان جب تک مادی حیثیت سے ترقی کرتے رہے، یہ زہر خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا، اور اوس کے مظاہر رونما نہیں ہوئے، لیکن جب دنیا کی اور قومون کی طرح ان کے مادی عروج وکمال کا زمانہ بھی ختم ہو گیا، اور ان کے اندر بھی انحطاط وزوال شروع ہوا تو اس زہر کے اثرات ظاہر ہونے لگے، صدیون تک قومی حشمت وجاہ کی پرستش سے اللہ واحد القہار کے جلال وجبروت کا احساس حد درجہ کمزور ہو گیا تھا، اور دلون مین صرف مادی قوتون کا رعب واستیلا راسخ تھا، اسلئے جب اپنی قوت کا خاتمہ ہو گیا، اور دوسری قومون نے غلبہ حاصل کر لیا تو قوت واقتدار کے پرستارون نے جنکی پیشانیان ایک طویل مدت سے اسی بُت کی چوکھٹ پر گڑی ہوئی تھین، اپنے نیاز وتعبد مین کوئی فرق پیدا ہونے نہ دیا، اور اپنی وفاداری پر بدستور قائم رہے،

مادی قوت واقتدار کا یہی رعب آج ملتِ اسلامیہ کا سب سے زیادہ شدید مرض ہو، مسلمانون کی سابقہ عظمت کے مقابلہ مین ان کی موجودہ طاقت کچھ بھی نہیں ہو، برخلاف اس کے مغرب اپنی ترقی کے دور شباب سے گذر رہا ہے، اسکی تہذیب وتمدن کی برقی روشنی کے سامنے مسلمانون کی آنکھیں جو نور حقیقی کی تجلیات سے محروم ہو چکی ہین خیرہ ہو رہی ہین، وہ دیکھ رہے ہیں، کہ مغرب کا تسلط آج تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے، اور حربی قوت کے علاوہ علوم وفنون

اور تہذیب وتمدن مین بھی اسکی حکمرانی روے زمین کے ہر حصہ پر تسلیم کر لی گئی ہو، پس جن دلون مین صدیون سے مادی اقتدار کے رعب نے آشیانہ بنا رکھا ہو، اُن کیلئے مغرب کے تسلط سے مرعوب ہونا محل تعجب نہیں، بلکہ توقع کے عین مطابق ہو، جو لوگ اس بات پر حیرت کرتے ہین کہ مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کی خوبیون کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو رہے ہین، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہین کہ اسلامی تہذیب تو مسلمانون نے اُسوقت چھوڑ دی تھی، جب مغرب اپنی وحشت اور بربریت کے دور سے بھی نہین گذر چکا تھا، اصل یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا مفہوم ہی عموماً غلط سمجھا جاتا ہو، اسلامی تہذیب کا دور خلافتِ راشدہ کے اختتام پر ختم ہو گیا تھا، اس کے بعد مسلمانون نے جس تہذیب کو فروغ دیا، وہ حقیقۃً اسلامی تہذیب نہ تھی، بلکہ اسلامی اور عجمی تہذیب کی ایک ایسی آمیزش تھی، جس سے ملت اسلامیہ کی روح حریت کہ بمنزلۂ متاع اصلی کے تھی فنا ہو گئی،

غرض مغرب کا یہی رعب آج دنیائے اسلام کی بنیادی کمزوری ہو، اور اسی کو دور کرنا وابستگانِ دامن نبوی کا اولین فرض ہو، مصلحین امت نے بارہا اسکے لئے کوششین کین اور اب بھی اپنے اپنے دائرون کے اندر اور اپنے اپنے حوصلہ وہمت کے مطابق کرتے جاتے ہیں، چنانچہ اس موضوع پر تقریرون اور تحریرون کا ایک وافر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، خصوصاً ہندوستان مین جہان مسلمانوں کا احساس دینی بمقابلہ دیگر ممالک اسلامیہ کے زیادہ بیدار ہے، لیکن "مغرب زدگی" کی ایک شامت یہ بھی ہے، کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت کیلئے کوئی چیز اسوقت تک قابل اعتنا نہیں ہوتی جب تک وہ مغربی لباس سے آراستہ نہ ہو، اور اس عموم مین ہمارے ملک کے نوجوانون کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہو، اسلئے ضرورت تھی کہ انگریزی زبان میں جو تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں کسی نہ کسی حد تک رائج ہو چکی ہے، اور ہندوستان مین ثانوی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ایک ایسی کتاب لکھی جائے، جسمین مسلمانون کے اصلی مرض کی تشخیص اور اسکے علاج کا صحیح طریقہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہو، پیش نظر تصنیف "اسلام اون دی کروس روڈس" (ISLAM ON THE CROSSROADS) اس ضرورت کو نہایت خوبی کے ساتھ پورا کرتی ہے، اس کا لائق مصنف محمد اسد (LEOPOLD WEISS) آسٹریا کا

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبِ قلم ہے، جس نے دس بارہ سال ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت مین گذارے ہین، اور مسلمانون کی موجودہ حالت کا نہایت غور وفکر سے مطالعہ کیا ہے، اس نے ان کی ماضی کی تاریخ اور لٹریچر پر بھی گہری نظر ڈالی ہے، اور پھر ان کی موجودہ بدحالی کے حقیقی اسباب وعلل کی جستجو بھی کی ہے، اسی دوران میں ہادیِ مطلق نے اُس کے قلب کو اپنے انوارِ ہدایت سے منور فرمایا، اور قبولِ اسلام کے شرف وامتیاز سے سربلندی بخشی، اسلام کی عظمت کا سچا احساس جو اس نومسلم کے قلم سے ظاہر ہورہا ہے، وہ اکثر سیزدہ صد سالہ مسلمانوں کے لئے عبرت وموعظت کا سبب ہوسکتا ہے،

تمام دنیا کی طرح اسوقت دنیائے اسلام بھی ایک انقلابی دور سے گذر رہی ہے، یہان بھی قدیم رسوم اور خیالات غائب ہورہے ہین، اور ان کی جگہ جدید خیالات رونما ہورہے ہین، لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی کا یہ انقلاب جو ترقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حقیقۃً مسلمانوں کو کہاں لے جارہا ہے، اور یہ "ترقی" اسلام کے مقاصد عالیہ سے کہاں تک مطابق ہے،؟ مسلمانوں کے سامنے اس وقت سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے، کہ تہذیب مغرب سے متعلق انکا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے،

فاضل مصنف نے یہ حقیقت پالی ہے کہ اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے بنیادی اصول یکسر مختلف ہین، اور دونوں میں تطابق پیدا کرنا قطعی طور پر ناممکن، اسلامی تہذیب کی بنیاد تمامتر مذہب پر قائم ہے، یہان مذہب سے مراد محض وہ "عبادت" نہین جو مخصوص ریاضتوں تک محدود ہے، مثلاً نماز یا روزہ، بلکہ اوس کا وسیع دائرہ انسان کی تمام عملی زندگی کو محیط ہے، یہی اسلام کا وہ مختص مقام ہے، جو اسکو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے، ہماری زندگی کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہو، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ، اور خدا کی عبادت نام ہے ان چند درچند اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جو خالص مذہبی ریاضتوں کے علاوہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہیں، عبادت کے مفہوم میں اس نقطہ نظر سے ہماری زندگی کے تمام بڑے اور چھوٹے کام شامل ہیں، اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ،

برخلاف اسکے جیسا مصنف نے دکھایا ہے مغرب جدید کی عمارت خالص مادی بنیادون پر قائم ہے اسکا نصب العین فطرت کی تفتیش وتحقیق اور اس پر حکمرانی کرنا ہے، اسکی زندگی تمامتر حیاتِ دنیاوی تک محدود ہے، مذہبی تخیل کی بنا اس عقیدہ پر ہے، کہ مادی حدود سے ماورا ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کا وجود بھی ہے، جسکی اطاعت ہم انسانوں کیلئے لازمی ہے، لیکن جدید مغربی تہذیب کسی ایسے قانون کی اطاعت تسلیم نہیں کرتی، وہ صرف اقتصادی، معاشرتی یا قومی قانون کی اطاعت ضروری خیال کرتی ہے، اس کا حقیقی معبود عیش وآسایش اور اس کا حقیقی فلسفہ، فلسفۂ قوت ہے، وہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتی، بلکہ بعض صورتون مین معاشرتی اغراض کیلئے مذہب کی ظاہری شکل کو قائم رکھنا چاہتی ہے، لیکن اسکے نظامِ عقلی مین (نعوذ باللہ) خدا کا کوئی مصرف نہیں ہے،

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ مغرب کی جدید مادی تہذیب عیسائیت کی گود میں کیونکر پرورش پاتی رہی لیکن یہ خیال ہی غلط ہے کہ موجودہ تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے، مصنف نے بہت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے کہ یہ تہذیب اُس بغاوت کا نتیجہ ہے، جو کلیسائے مسیحی کے صدیوں کے استبداد وتشدد کے خلاف یورپ کے قوائے ذہنی نے بالآخر برپا کی، اور مغرب کی تمام سائنٹفک اور مادی ترقیان دراصل اسی بغاوت کا حاصل ہین، اسکے بعد موصوف نے اس واقعہ پر تاریخ کی روشنی ڈالی ہے، کہ کلیسا کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں یورپ بڑی حدتک عربون کا رہینِ منت ہے، انھون نے یونانی علوم وتمدن کے بہترین اجزا اخذ کرکے اپنے علوم وتمدن کی آمیزش سے ان کو از سرِ نو زندہ کیا، اور ٹھیک اس وقت جب یورپ کلیسا کی تعدیون سے تنگ آکر اپنی آزادی کے لئے تاریکی میں ہاتھ پیر مار رہا تھا، اُسے اُن علوم وتمدن کی روشنی دکھا کر آزادی کی شاہراہ پر لا کھڑا کر دیا، اس طرح عربوں کی وساطت سے یورپ کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی، مصنف کا بیان ہے کہ قرون وسطی نے یورپ کے قوائے اجتہادی کو بالکل برباد کر دیا تھا، تمام علوم پر جمود کی کیفیت طاری تھی، وہم پرستی کا تسلط ہر جگہ تھا، معاشرت ایسی ابتدائی اور ناقص حالت میں تھی، کہ آج اس کا یقین بھی مشکل سے ہوگا، اسوقت دنیائے اسلام کا علمی اور تمدنی اثر جو پہلے مشرق مین محاربات صلیبی اور مغرب مین اندلس کی عالیشان

یونیورسٹیوں کے ذریعہ اور پھر بعد میں اُن تجارتی تعلقات کی راہ سے جو جینوا اور وینس کی جمہوریتوں کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے تھے، رونما ہوا اور تہذیب یورپ کے بند دروازوں کو کھٹکھٹانا شروع کیا، یورپ کے فضلاء اور فلاسفہ کی خیرہ نگاہوں کے سامنے ایک دوسری ہی تہذیب ظاہر ہوئی نفیس، ترقی پذیر، ولولہ انگیزیوں سے معمور اور اُن خزینوں کی مالک جنھیں یورپ مدتوں پہلے کھو کر فراموش کر چکا تھا لیکن عربوں نے قدیم یونانی علوم و تمدن کے احیا کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا، اونھوں نے خود اپنی ایک بالکل جدید سائنٹفک دنیا پیدا کی، اور ترقی کی نئی راہیں دریافت کرکے انھیں ترقی دی، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ ہمارے موجودہ سائنٹفک دور کا افتتاح یورپ کے شہروں میں نہیں، بلکہ دمشق، بغداد، قاہرہ، اور قرطبہ کے اسلامی مرکزوں میں ہوا" چنانچہ یہ اسلامی تعلقات کی اسی حیات بخشی کا اعتراف ہے کہ یورپ اپنی بیداری کے اس دور کو "نشاۃ ثانیہ" (RENAISSANCE) کے نام سے موسوم کرتا ہے،

اسلامی تعلقات کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ ہوا کہ یورپ کے بہترین دماغوں نے کلیسا کے بند استبداد سے آزادی حاصل کرنے کیلئے ایک تازہ قوت کے ساتھ جنگ شروع کر دی، ابتداءً اس جنگ نے تحریک اصلاح کی صورت اختیار کی جو تقریباً بیک وقت مختلف ملکوں میں جاری ہو گئی، اگر یہ تحریک اعتدال کے ساتھ جاری رہتی تو بہت ممکن تھا، کہ یورپ میں سائنس اور مذہب کی کشید گی ایک حد تک دور ہو جاتی، لیکن کلیسا کی تعدیاں اس درجہ تک پہنچ چکی تھیں، کہ ان کی اصلاح میں اعتدال قائم رہ نہ سکا، علاوہ بریں تھوڑے ہی دنوں میں یہ تحریک مذہبی حدود سے نکل کر مختلف جماعتوں کی سیاسی کشمکش سے وابستہ ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا تسلط روز بروز کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں انقلاب فرانس کے ہاتھوں کلیسا کا استیلا ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا، اسکے بعد ہی صنعت و حرفت کی ترقی کا دور شروع ہوا، اور یورپ جو مذہب کی قید سے ایک گونہ آزاد ہو چکا تھا، پوری سرگرمی کے ساتھ مادی ترقی کی ان جدید راہوں میں مشغول و منہمک ہو گیا، انیسویں صدی کے دوران میں مذہب کا وہ خفیف سا تعلق بھی جو انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد باقی

رہ گیا تھا، منقطع ہو گیا، اور یورپ کلیسا کے تلخ تجربہ کی بنا پر مذہب کی ہر شکل و نوع کا قطعی طور پر مخالف ہو گیا، یہ صحیح ہو کہ مغرب میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اپنے اندر سچا مذہبی احساس رکھتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے، اکثریت انھی لوگوں کی ہے، جو مذہبی قیود سے آزاد ہیں، مصنف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا عام باشندہ خواہ وہ جمہوریت پسند ہو، یا فاسستی، نظام سرمایہ داری کا موید ہو یا اصول اشتراکی کا، غرض کسی سیاسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، صرف ایک ہی یقینی مذہب کو جانتا ہے یعنی مادی ترقی کی پرستش اور صرف ایک ہی عقیدہ رکھتا ہے، یعنی زندگی کا مقصد بجز اس کے کچھ بھی نہیں، کہ اسے روز بروز زیادہ پر عیش اور "فطرت سے آزاد" بنایا جائے،

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تہذیب لازمی طور پر اس تمدن کے لئے زہر قاتل ہو گی، جسکی بنیاد مذہب پر قائم ہے، اسلام میں پہلا اور سب سے بڑھکر مقدم مقصد انسان کی باطنی اور اخلاقی ترقی ہے، لیکن مغرب کی جدید تہذیب میں حالت بالکل برعکس ہے، وہاں مادی افادیت کا خیال اعمال انسانی کے تمام مظاہر پر چھایا ہوا ہے، اور اخلاقیات کی اہمیت روز بروز زائل ہوتی جاتی ہے،

مذکورہ بالا مذہبی اور تمدنی ناموافقت کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے، جسکی بنا پر مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اتباع سے پرہیز کرنا چاہئے، وہ یہ کہ مغربی تہذیب اسلام کے خلاف ایک دیرینہ بغض و عناد کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے یہ جذبہ جسب تصریح مصنف ایک حد تک قدیم یونانی اور رومن تہذیب کا ترکہ ہے، یونان اور رومہ کے باشندے صرف اپنے ہی کو تہذیب و تمدن کا مالک سمجھتے تھے، اُن کے علاوہ تمام دنیا کے لوگ خصوصاً وہ جو بحر روم کے مشرق میں آباد تھے، "بربری" اور "وحشی" تھے، یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی یورپ اپنے علاوہ تمام دوسری قوموں اور نسلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے،

لیکن برخلاف دیگر اقوام و مذاہب کے اسلام کے خلاف یورپ کا جذبہ حقارت ہی کا نہیں، بلکہ ایک دیرینہ اور مستقل دشمنی کا جذبہ بھی ہے، اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے متعلق یورپ ہمیشہ غور و تامل سے کام لیتا ہی اور آج

جب کہ ہر چیز سائنٹفک تحقیق کی روشنی میں دیکھی جارہی ہے، مذاہب کے مطالعہ و تفحص میں بھی جذباتی میلان کا دخل کم ہوتا جاتا ہے، لیکن جوں ہی یورپ کی توجہ اسلام کی طرف ہوتی ہے، اس کا دماغی توازن دفعۃً بگڑ جاتا ہے، اور تمام سائنٹفک غیر جانبداری پس پشت ڈال دی جاتی ہے، یورپ کے اکابر مستشرقین بھی جیسا کہ مصنف نے صاف صاف بیان فرمایا ہے، اسلام سے متعلق ایسی صریح جانب داری کے مرتکب ہوتے آئے ہیں، جو اصول علمی کے سراسر منافی ہے، وہ اپنی تحقیق کی ابتدا اُس نتیجہ سے کرتے ہیں، جو ان کا تعصب پہلے سے قائم کر لیتا ہے، اسلامی روایات کو مسخ کر کے پیش کرنا ان کا عام شیوہ ہے، اسمیں کسی خاص ملک کی تخصیص نہیں، انگلستان، جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، اور ہالینڈ، بلا استثناء ہر ملک کے مستشرقین نے یکساں طور پر اسلام کے خط و خال کی تصویر نہایت کریہہ اور نفرت انگیز شکل میں کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کرنی چاہی ہے، اور چونکہ یہ مستشرقین اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے ماحول کے ترجمان ہیں، اسلئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تمام یورپ مذہب اور تمدن دونوں کے لحاظ سے اسلام کے خلاف ایک مستقل عناد رکھتا ہے، اسکا ایک سبب تو وہی قدیم یونانی اور رومن تہذیب کا ترکہ یعنی "یوروپین" اور "باربیرین" کی خود ساختہ تفریق ہے، اور دوسرا سبب جس کا تعلق براہ راست اسلام سے ہے، قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں پایا جاتا ہے،

فاضل مصنف نے تصریح فرمائی ہے کہ متحدہ یورپ اور اسلام کے درمیان پہلا زبردست تصادم محاربات صلیبی کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہ عین اسوقت پیش آیا جب یوروپین تہذیب اپنے ابتدائی مدارج سے گذر رہی تھی، محاربات صلیبی سے پیشتر بھی اہل یورپ اور مسلمانوں میں لڑائیاں ہو چکی تھیں، مثلاً صقلیہ اور اندلس کی عرب فتوحات اور جنوبی فرانس پر عربوں کا حملہ، لیکن یہ معرکے اسوقت پیش آئے تھے، جب یورپ کا جدید تمدن شروع نہیں ہوا تھا، اسلئے ان کی اہمیت تمامتر مقامی تھی، برخلاف اسکے محاربات صلیبی میں اسلام کا مقابلہ یورپ کے کسی خاص ملک یا قوم سے نہ تھا، بلکہ ہر ملک و قوم نے متحد ہو کر زور آزمائی کی تھی، اور یہ پہلا موقع تھا جب یورپ نے اپنی وحدت کا احساس کیا، اس سے پہلے یورپ اعظم اینگلو سیکسن، جرمن، فرینک، نارمن، اٹالین، ڈین وغیرہ قوموں میں تقسیم تھا، لیکن محاربات صلیبی ہی کے دوران میں "مغربی تہذیب" کا جدید تخیل پیدا ہوا، جسمیں یورپ کی تمام قومیں یکساں طور پر شریک تھیں، یہ اتحاد و تمامتر اس عناد کا پیدا کردہ

تھا جس نے اسلام کے خلاف یورپ کی ہر قوم کو برانگیختہ کر دیا تھا،

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ مشرق و مغرب کے تعلقات کی تلخی اُن ناقابلِ بیان مظالم کا نتیجہ ہے، جو مُنیا بن صلیب کے "مقدس" ہاتھوں سے ممالک اسلامیہ کو پہنچے، اور بغض و عناد کا جو بیج محاربات صلیبی نے بویا، وہ برابر نشو و نما پاتا رہا، ورنہ حقیقۃً تعلقات کی ایسی شدید ناگواری کے لئے کوئی خلقی سبب موجود نہ تھا، یہ ضرور ہے، کہ اسلامی اور مغربی تہذیبیں بالکل مختلف اور جداگانہ بنیادوں پر قائم ہیں، لیکن جیسا کہ موصوف نے تاریخی دلائل سے دکھایا ہے ان کے درمیان دوستانہ روابط کا قیام ناممکن نہ تھا اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اُس نے یورپ کی طرف ہمیشہ رواداری اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا، مثلاً جب خلیفہ ہارون رشید نے شہنشاہ شارلیمین کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی تھی، تو یہ اسی جذبۂ رواداری کا عملی اظہار تھا، ورنہ قوم فرینک کی دوستی سے خلیفہ کو کسی مالی منفعت کی توقع نہ تھی، یورپ اسوقت اپنے تمدن کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا، اور اسمیں اسلامی تعلقات سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہ تھی، تاہم اسکی طرف سے ان تعلقات کی نسبت کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا، ہمیں یقین ہے کہ اگر محاربات صلیبی کے پیش آجانے سے اسلام اور یورپ کے باہمی تعلقات کا شیرازہ دفعۃً درہم برہم نہ ہوگیا ہوتا، تو باوجود مذہبی اور تمدنی اختلافات کے یورپ اس شدت کے ساتھ آج اسلام کا دشمن نہ ہوتا، تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کے درمیان سیکڑوں لڑائیاں ہوئیں، اور فراموش کر دی گئیں، انھوں نے باہمی تعلقات پر کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑا، لیکن محاربات صلیبی کی اثر اندازی صرف میدان کارزار تک محدود نہ تھی، اون سے اسلام کے خلاف یورپ کا ذہن و دماغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسموم ہوگیا، مغرب کے کیتھولک پادریوں نے جو علوم فنون کے تنہا مالک تھے، جاہل عوام کے سامنے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے ایک ایسا نفرت انگیز نقشہ پیش کیا جس کے نقوش مرور زمانہ اور تحقیق علمی کے باوجود آج تک مٹ نہ سکے،

نفرت و عداوت کا جو بیج محاربات صلیبی کے ہاتھوں بویا گیا تھا، وہ بہت جلد بارآور ہونے لگا، اندلس کے عیسائیوں نے اسلامی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کیلئے جد وجہد شروع کر دی، اور اس مقصد کے حصول میں جتنی

تاخیر ہوتی گئی، اتنا ہی اسلام کے خلاف یورپ کا جذبۂ عناد زیادہ مضبوط اور مستقل ہوتا گیا، بالآخر انتہائی مظالم اور بے دردگی کے ساتھ اندلس کے بے شمار مسلمان قتل و برباد کردئے گئے، اور جو اُن روح فرسا تعدیوں کے بعد باقی رہ گئے، اُنھیں جلا وطن کردیا گیا،

ہنگامۂ اندلس کی بازگشت ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی، کہ ایک تیسرا نہایت اہم واقعہ پیش آگیا، جس نے یورپ اور اسلام کے رہے سہے تعلقات کو بھی برباد کردیا، یعنی ترکوں کا سلطنت بازنطینی کے پایۂ تخت قسطنطنیہ پر قبضہ کرلینا، سقوطِ قسطنطنیہ کے بعد یورپ میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ صدیوں تک قائم رہا، اور اب اسلام کے خلاف یورپ کی دشمنی صرف مذہبی اور تمدنی اختلاف تک محدود نہ رہی، بلکہ اوس نے سیاسی اہمیت بھی حاصل کرلی، جسکے باعث اوسکی شدت اور بڑھ گئی، یہ شدت یہان تک بڑھی، کہ تمدنی اور مذہبی تغیرات کے بعد بھی اسمیں کوئی فرق پیدا نہ ہوا، اصلاحِ کلیسا کے عہد میں یورپ مختلف جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہوگیا تھا، جو ایک دوسرے کو تباہ و برباد کردینا چاہتے تھے، لیکن اسلام کی نفرت سب کے دلوں میں یکساں طور پر راسخ تھی، پھر ایک زمانہ ایسا آیا، جب مذہب کا اثر یورپ میں زائل ہونے لگا، لیکن اسوقت بھی اسلام کی نفرت بدستور باقی رہی، بالآخر وہ دور شروع ہوا جب فضلائے یورپ دیانتداری کے ساتھ غیر ملکی تمدنوں کا مطالعہ کرنے لگے، لیکن اسلام کے معاملہ میں انکی ضلالت اندیشی اپنی جگہ پر قائم رہی،

ان تاریخی حالات کے باوجود آج بعض اسلامی حلقوں میں یہ آواز سنائی دیتی ہے، کہ اسلام کے خلاف یورپ کے بغض و عناد کی شدت اب کم ہوتی جاتی ہے، اور وہ اسلامی تعلیمات اور اصولِ معاشرت سے روز بروز قریب تر ہوتا جارہا ہے، بہتیرے مسلمان یہ توقع رکھتے ہیں، کہ عنقریب تمام یورپ اسلام کا حلقہ بگوش ہوجائے گا، فاضل مصنف نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس دلفریب غلط فہمی کو دور کیا ہے، موصوف کو یقین ہے کہ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو بے لاگ تنقید کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہے، اور جو حسب ارشاد رسول مقبول صلعم بالآخر تمام نوع انسانی کا ایک عالمگیر مذہب ہو کر رہے گا، لیکن مستقبل کے حدود تک نظر کی رسائی ہے، اس واقعہ کے عالمِ ظہور میں آنے کی کوئی علامت ابھی دکھائی نہین دیتی، موصوف کا خیال ہے کہ یہ امکان صرف اسی وقت عمل میں آسکتا ہے، جب یورپ کے تمدنی غرور و تمرد کی عمارت معاشرتی تباہکاریوں کے ہاتھوں بالکل برباد ہوجائے، اور اسکی موجودہ ذہنیت اس حد تک بدل جائے، کہ اسمیں مذہب کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے آج مغربی دنیا صرف اپنے مادی کارناموں کی پرستش میں محو ہے، وہ صرف آسایش کو اپنی تمام کوششوں کا نصب العین بنا رہی ہے، اسکی مادیت اور مذہب سے مخالفت بڑھتی ہی جارہی ہے اور اسمیں کوئی تخفیف نہیں ہو رہی ہے، جیسا کہ بعض سادہ لوح مسلمانوں کا خیال ہے،

"یورپ آج اسلام سے جسقدر دور ہے پہلے کبھی اس سے زیادہ نہ تھا، ممکن ہے کہ ہمارے مذہب کے خلاف اسکی عملی دشمنی کم ہورہی ہو، لیکن اس کا سبب اسلامی تعلیمات کی قدردانی نہیں، بلکہ وہ روز افزون تمدنی انحطاط و اختلال ہے، جو دنیائے اسلام میں واقع ہورہا ہے، مغرب ایک زمانہ میں اسلام سے خائف تھا، اور اس خوف نے اُسے ہر اس شے کا دشمن بنا دیا تھا، جسمیں اسلامی رنگ پایا جاتا تھا، خواہ وہ شے خالص روحانی اور معاشرتی معاملات ہی سے تعلق رکھتی ہو، لیکن ایسے وقت میں جب کہ اسلام یورپ کے ایک مخالف کی حیثیت سے اپنی اہمیت کا بیشتر حصہ کھو چکا ہے، یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے، کہ تخفیف خوف کے ساتھ یورپ اُن جذبات کی شدت میں بھی کچھ کمی کردے، جو اسلام کے خلاف ابتدا میں اس نے قائم کرلئے تھے، اگر ان جذبات کے اظہار عمل میں کمی پیدا ہوگئی ہے، تو اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں ہے، کہ مغرب باطنی طور پر اسلام سے زیادہ قریب آگیا ہے، اوس کا یہ طرزِ عمل اسلام سے متعلق صرف اُسکی بے پروائی کو ظاہر کرتا ہے"

مغربی تہذیب مذہب کی مخالف جیسی پہلے تھی ٹھیک ویسی ہی آج بھی ہے، یہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چند اسلامی انجمنیں تبلیغ کا کام کر رہی ہیں، اور اُن کی کوششوں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، لیکن یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ مغرب پھر مذہب کی طرف رجوع کر رہا ہے، علاوہ بریں اس معاملہ میں اسلامی مشن کوئی انفرادیت بھی نہیں رکھتا، عیسائیت کے بے شمار روحانی فرقون کے علاوہ مغرب میں تھیوسیفک تحریک کا بھی اچھا خاصہ

اثر ہے، اور یورپ کے مختلف پایہ تختوں میں بودھ مذہب کے معبد اور مشن بھی موجود ہیں، جرمنی میں بودھ مشن اسلامی مشن سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے، اس کامیابی کی بنا پر مسلمانوں ہی کی طرح بودھ مذہب والے بھی یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ یورپ اُن کے مذہب سے قریب ہوتا جارہا ہے، لیکن بقول مصنف دونوں صورتوں میں یہ دعوی مضحکہ انگیز ہے، چند افراد کا اسلام یا بودھ مذہب میں داخل ہوجانا مغربی تہذیب پر کوئی قابل ذکر اثر ڈالنے کیلئے کافی نہیں،

موصوف کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی مشن چند افراد کے دلوں میں تلاش و تحقیق کے ایک بہت ہی محدود شوق سے زیادہ ابتک کچھ پیدا نہ کرسکا، اور وہ بھی زیادہ تر اس اثر کی وجہ سے جو ایک غیر ملکی مذہب تخیل پسند دماغوں پر ڈالتا ہے، بلاشبہ بعض لوگوں نے محض حق کی تلاش میں سچائی کے ساتھ تبدیل مذہب کیا ہے، لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہے، اور ان کے عقائد تہذیب جدید کی رو پر کچھ بھی اثر نہیں ڈالتے، برخلاف اسکے جو لوگ ہر روز خالص مادی مسلکوں میں داخل ہوتے جاتے ہیں، انکی تعداد شمار سے باہر ہے، اور انہی کے خیالات سے مغربی تہذیب کے رجحانات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے،

اوپر دکھایا جاچکا ہے کہ چونکہ اسلامی اور مغربی تہذیبوں کی بنیادیں بالکل مخالف اصولوں پر قائم ہیں، اسلئے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا کسی طرح ممکن نہیں، ایسی صورت میں یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی، کہ مسلمانوں کو جو تعلیم مغربی اصول پر دی جائے گی، وہ اُن اثرات سے محفوظ رہ سکے گی، جو اسلام کے مخالف ہیں،

مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی وقت کے اُن اہم مسائل میں ہے، جو ہنوز ایک متفق علیہ فیصلہ کے محتاج ہیں، ہمارے ارباب فکر میں ایک جماعت صرف علوم دینیہ کی تعلیم کو ضروری بلکہ کافی خیال کرتی ہے، دوسری جماعت ان روشن خیال مفکرین کی ہے، جو تمامتر علوم جدیدہ کے شیدائی ہیں، اکثریت انہی کی ہے، اور موجودہ نسل انہی کی متبع اور ہم نوا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک تیسری جماعت بھی ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ

اسلام دین اور دنیا دونوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے، اسلئے وہ علوم بھی جو مادی اور "دنیاوی" ہونے کی حیثیت سے خالص مذہبی حلقوں میں مسترد کردئے گئے ہیں، مسلمانوں کی توجہ کے مستحق اور رفتار زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے ضروری ہیں، فاضل مصنف اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں، کہ مذہب کا اثر ان اشخاص کے دلوں سے جنھوں نے مغربی اصولوں پر تعلیم پائی ہے، سرعت کے ساتھ زائل ہو رہا ہے، تعلیم یافتہ طبقوں میں مذہب سے جو بے تعلقی اور برگشتگی پھیلی ہوئی ہے، اس کا سبب نادانوں کے نزدیک یہ قرار دیا جاتا ہے، کہ مغربی سائنس مذہب کی صداقت کو غلط ثابت کررہی ہے، موصوف اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ سائنس مذہب کی صداقت کے خلاف کوئی معقول حجت پیش کرنے سے اسوقت تک قاصر ہے اور اس برگشتگی کا سبب محض یہ ہے، کہ تہذیب جدید کا عقلی ماحول جو نہایت شدت کے ساتھ خلاف مذہب ہے، نوجوان مسلمانوں کے قوائے مذہبی کو اپنے اثر سے بالکل ماؤف کردیتا ہے

اسوقت بنیادی سوال یہ ہے کہ علوم جدیدہ سے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے،؟

مسلمانوں کیلئے مغربی تعلیم کو مضر قرار دینے کے یہ معنی نہیں کہ اسلام نفس تعلیم کا مخالف ہے، جو لوگ اسلام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں، وہ یا تو مذہب اور تاریخ دونوں سے ناواقف ہیں، یا تعصب کی شدت سے مغلوب ہوکر دیدہ و دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں، قرآن پاک شروع سے آخر تک عقل و شعور اور فکر و تدبر کی دعوتوں سے پُر ہے، پھر طلب علم کی فرضیت اور اہمیت پر مشہور حدیث طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ کے علاوہ ارشادات نبوی کا ایک خاصہ ذخیرہ موجود ہے، اسلام علوم جدیدہ کی تحصیل سے نہیں روکتا، مسلمانوں کو ان علوم کے حاصل کرنے اور مغربی قوموں کی طرح سائنٹفک اور اقتصادی حیثیت سے ترقی کرنے کی پوری اجازت ہے، مغربی تعلیم فی نفسہ ان کیلئے کوئی مضرت نہیں رکھتی، لیکن جو چیز ان کیلئے مضرت رکھتی ہے، وہ یہ ہے، کہ مغربی آنکھوں سے دیکھیں اور مغربی دماغوں سے سوچیں، فاضل مصنف نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ علم بذات خود نہ مشرقی ہے، اور نہ مغربی لیکن اسکی تحصیل و مطالعہ میں ہر قوم کا نقطۂ نظر اسکی مخصوص تمدنی ذہنیت کے مطابق ہوتا ہے، مغرب کی موجودہ ذہنیت اپنی اعلی عقلیت کے باوجود تمامتر مادی اور مخالف مذہب ہے، اسلئے اس کا پورا تعلیمی نظام بھی اسی رنگ میں رنگا

ہوا ہے، جہاں تک جدید تجربی سائنسوں کا تعلق ہے ان کی تحصیل مسلمانوں کیلئے مضرت رساں نہیں مضرت صرف اس مغربی ذہنیت میں ہے جسکے توسط سے مسلمان اُن سائنسوں کو حاصل کر رہے ہیں،

اگر مسلمان طلب علم کے فریضہ کی ہمیشہ پابندی کرتے، تو آج انھیں ان جدید سائنسوں کیلئے یورپ کا محتاج ہونا نہ پڑتا، اور وہ اسکی طرف "ویسی نگاہ نہ ڈالتے جیسی کوئی پیاس کا مارا ریگستان میں پڑا ہوا افق کے سراب پر ڈالتا ہے" لیکن غفلت میں مبتلا رہ کر انھوں نے اپنے مواقع کھو دئے، اور یورپ ترقی کی راہ میں اُن سے بہت آگے بڑھ گیا، اب وہ مجبور ہیں کہ جدید سائنسوں کو یورپ کے تعلیمی واسطہ سے حاصل کریں، لیکن اسمیں بھی احتیاط کی ضرورت ہے، مصنف کی رائے ہے کہ یورپ سے ہمیں صرف سائنٹفک مواد (Matter) اور طریقہ (Method) حاصل کرنا چاہئے، اسکے علاوہ اور کچھ نہیں، موصوف کے نزدیک مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تمام علوم مغربی میں سے صرف علوم طبیعیہ (Natural Sciences) اور ریاضیات کی تعلیم کو نمایاں جگہ دینی چاہئے، باقی مغربی فلسفہ، مغربی لٹریچر، اور وہ تاریخ عالم جو مغربی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہو، اسلامی نصاب تعلیم میں ان سب کی اہمیت بہت کم کر دینی چاہئے، مغربی لٹریچر کی تعلیم کو محض اسکی لسانی حیثیت تک محدود رکھنا چاہئے، اسکی تعلیم کا جو طریقہ اسوقت ممالک اسلامیہ میں رائج ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ مغربی تہذیب و تمدن کی روح مسلمان طلبہ کے خادم دماغوں میں سرایت کر جاتی ہے، جو اسلام کی روح کے ساتھ کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی؛ ضرورت ہے، کہ مغربی لٹریچر کے بجائے اسلامی لٹریچر کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے "تاکہ اسلامی تمدن کی وسعت و زرریزی مسلمان طلبہ کے ذہنوں کو متاثر کرے اور ان میں مستقبل کیلئے ایک نئی امید پیدا ہو"

یورپین لٹریچر کی مروجہ تعلیم سے زیادہ مسلمان نوجوانوں کے لئے اس تاریخ عالم کا مطالعہ مضر ہے، جو اہل مغرب کے قلم سے نکلتی ہے، مورخین یورپ جب دنیا کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں، تو اُن کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یورپ کی نسلیں اور ان کی تہذیب تمام دوسری نسلوں اور تہذیبوں پر فوقیت رکھتی ہیں، اور اسی خود ساختہ فوقیت کو وہ ساری دنیا پر حکمرانی کرنے کیلئے ایک سند تصور کرتے ہیں، دنیا کی جو تاریخ ان کے قلم سے نکلتی ہے، وہ

"حقیقۃً ایک وسیع پیمانہ پر مغرب ہی کی تاریخ ہوتی ہے، جسمیں دوسری قوموں کا ذکر صرف اسی حد تک آتا ہے، جس حد تک اُن کے وجود اور ترقی سے خود یورپ پر کوئی اثر براہ راست پڑتا رہا" ظاہر ہے کہ ایسی تاریخ کا مطالعہ مشرقی نوجوانوں کے دماغوں پر صرف یہ اثر ڈالے گا کہ وہ اپنے تمدن، اپنے ماضی اور نیز مستقبل کے امکانات میں یورپ کی قوموں سے بہت گرے ہوئے ہیں،

سخت ضرورت ہے کہ اس اثر کو دور کرنے کیلئے اسلامی اداروں میں تاریخ کی تعلیم پر نظر ثانی کی جائے، بلاشبہہ یہ کام آسان نہیں، اسکے لئے تمام تاریخ کی تفتیش و تحقیق از سر نو کرنا پڑے گی، لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا، تو مسلمان طلبہ کے دلوں میں اسلام کی حقارت کا جذبہ روز بروز زیادہ مضبوط ہوتا جائیگا اور اپنی پستی کا احساس اُن کے اندر بڑھتا ہی جائے گا، "اگر مسلمان ابتک سائنٹفک تحقیقات کی طرف سے غافل تھے، تو آج اس غلطی کی تلافی اسطرح نہیں ہو سکتی کہ ہم بے سوچے سمجھے مغربی علوم کو قبول کر لیں، سائنس سے متعلق ہماری تمام پچھلی کوتاہیاں اور ہمارا افلاس اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جو مغربی نظام تعلیم کی کورانہ تقلید سے دنیاے اسلام کے مذہبی امکانات پر پڑے گا، اگر ہم اسلام کی حقیقت کو ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں تہذیب مغرب کے عقلی ماحول سے بچنا ضروری ہے، جو ہماری سوسائٹی اور ہمارے میلان پر غلبہ پا رہا ہے، مغربی اخلاق و آداب اور مغربی طرز معاشرت کی تقلید سے مسلمان رفتہ رفتہ مغربی مطمح نظر کو اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں ظاہری وضع و قطع کی تقلید بتدریج ویسی ہی ذہنیت بھی پیدا کر دیتی ہے"؛

آج کل اکثر تعلیم یافتہ اشخاص کا خیال ہے کہ لباس اور وضع کو کسی قسم کی روحانی اہمیت حاصل نہیں ہے، اور نہ مذہب رسم و رواج کا پابند ہے، مصنف کو بھی اعتراف ہے کہ اسلام میں تنگ ذہنی نہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں، کہ کسی تہذیب کی ظاہری وضع و قطع کو اختیار کرنا اس تہذیب کی روح سے متاثر ہوئے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، اور وہ بالکل صحیح فرماتے ہیں، کہ قطع نظر اس واقعہ کے کہ مغربی تہذیب کی بہتیری باتیں صریحی طور پر تعلیمات اسلام کے خلاف ہیں، مثلاً عورتوں اور مردوں کا آزادانہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا یا سود کا رواج ایسے

تہذیب خود اپنی فطرت کی بنا پر بھی تمامتر مخالف مذہب ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں تک اس تہذیب کی اثراندازی کا تعلق ہے، وہ معاشرتی زندگی کے "اہم" اور "غیر اہم" پہلوؤں کی تفریق کو روا نہیں رکھتے، علاوہ بریں اگر کوئی مسلمان یورپ کے لباس اخلاق و آداب اور طرز معاشرت کی تقلید کرتا ہے، تو خواہ اس کا ادعا کچھ بھی ہو، وہ اس حقیقت کو فاش کر دیتا ہے، کہ اسکے نزدیک یورپین تہذیب کو ترجیح حاصل ہے" اس موقع پر موصوف نے چند سطروں میں جو کچھ لکھدیا ہے، وہ اپنے اندر عبرت و بصیرت کا ایک پورا دفتر رکھتا ہے، فرماتے ہیں "کسی غیر تہذیب کی تقلید کا میلان خود اپنی پستی کے احساس کا نتیجہ ہے، یہی اور صرف یہی حال اُن مسلمانون کا ہے، جو مغربی تہذیب کی تقلید کرتے ہین، وہ اس تہذیب کی قوت، فنی استعداد اور ظاہری چمک دمک کا مقابلہ دنیاے اسلام کی زبون حالی سے کرتے ہیں، اور پھر یہ سمجھتے ہیں، کہ ہمارے زمانہ میں مغربی راہ کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے، اسلام کے سر خود اپنی کوتاہیوں کا الزام عائد کرنا آجکل ایک دستور ہو گیا ہے، ہمارے نام نہاد عقلا زیادہ سے زیادہ جو کرتے ہین، وہ یہ کہ معذرت اور صفائی کا پہلو اختیار کر لیتے ہین، اور اپنے اور دوسروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں، کہ اسلام مغربی تہذیب کی روح کو بخوبی قبول کر سکتا ہے"

سطور بالا میں مصنف نے جس ذہنیت کو دکھایا ہے، وہ اسی مرعوبیت کا نتیجہ ہے، جس کا ذکر ہم نے اس تبصرہ کے ابتدائی حصہ میں کیا ہے، مغرب کا رعب مسلمانوں کے دماغون پر اس درجہ مستولی ہو گیا ہے، کہ وہ ہر چیز کو اسی کے معیار سے جانچتے ہیں چنانچہ مذہب کے ساتھ بھی ان کا طرز عمل یہی ہے، وہ اس حقیقت کے اعلان کی جرات تو نہیں رکھتے کہ اسلام اور مغربی تہذیب کی بنیادیں بالکل مخالف اصولوں پر قائم ہیں، اسلئے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا کسی صورت سے ممکن ہی نہیں، لیکن اپنے خیال میں اسلام کی حمایت یوں کرتے ہیں کہ اس کے اصولوں کو کھینچ تان کر مغربی تہذیب سے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مصنف نے اسی افسوسناک ذہنیت کو دور کرنا چاہا ہے، اور مسلمانون کو غیرت دلائی ہے، کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے عار سمجھ رہے ہیں، وہ حقیقۃً باعث صد فخر و ناز ہے، فرماتے ہین:

"احیاے اسلام کے حصول کیلئے اصلاحی تدبیریں اختیار کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہب

کی نسبت معذرت کا پہلو بالکل ترک کر دیں، مسلمان کو اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہئے، اُسے سمجھنا چاہیے کہ وہ تمام دنیا سے مختلف اور ممیز ہستی ہے، اور اسے اپنی اس انفرادیت پر حد درجہ فخر ہونا چاہئے، اُسے چاہیے، کہ اس فرق کو ایک بیش قیمت وصف سمجھ کر محفوظ رکھنے کی کوشش کرے، اور دلیری کے ساتھ دنیا کے سامنے اس کا اعلان کرے، نہ یہ کہ اسکے لئے معذرت پیش کرے، اور دوسرے تمدنی حلقوں میں ضم ہوجانے کی کوشش کرے، اسکے یہ معنی نہیں کہ مسلمان اپنے کو خارجی اثرات سے بالکل علحدہ رکھیں، اپنی تہذیب کو برباد کئے بغیر بھی کسی غیر تہذیب کے اثرات کو قبول کرنا ہمیشہ ممکن ہے"

فاضل مصنف کا خیال ہے، کہ اب تک مسلمانوں کی اصلاح میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے کا سبب محض یہ ہے، کہ سنت نبوی کے اتباع پر کافی زور نہیں دیا گیا، ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ سنت کی پابندی اسلام کے وجود و ترقی کی مترادف اور اس سے غفلت اسکے اختلال و زوال کے ہم معنی ہے، اُن کے نزدیک مسلمانوں کے تمام امراض ملی کا واحد علاج اتباع سنت ہے، اور یہی وہ مخصوص تجویز ہے، جو موصوف کو عہد حاضر کے اکثر مصلحین امت سے ممتاز کر دیتی ہے، سنت کی جو اہمیت بیسویں صدی کے اس نو مسلم کے دل میں راسخ ہے، کاش ایک ٹکڑا بھی اُن مسلمانوں کو نصیب ہوتا، جو صدیون سے اسلام کے مدعی ہین، لیکن اتباع رسول کی ناگزیری کے قائل نہیں، مصنف نے صحیح فرمایا ہے، کہ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے، جو کسی محل میں داخل ہونے کی خواہش کرتا ہے، لیکن اس کنجی کو استعمال کرنا نہیں چاہتا، جس کے بغیر دروازہ کا کھلنا ممکن ہی نہیں، موجودہ دور میں بعض دانش فروشوں نے یہ خیال پیش کیا ہے، کہ اسلام کی حقیقت سنت نبوی سے بے نیاز رہ کر بھی حاصل ہو سکتی ہے، یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ حضور کی حیات طیبہ قرآن پاک کی ایک زندہ تفسیر تھی، اور آپ نے جو احکام صادر فرمائے، وہ اسی ذات باری تعالیٰ کے حکم و ایماء سے فرمائے، جس نے یہ کتاب مقدس آپ پر نازل فرمائی تھی، ما ینطق عن الھوی مصنف کا قلب سنت کے ولولہ سے ایسا معمور ہے کہ وہ رسول کے احکام میں اس تفریق کو جائز نہیں سمجھتے، کہ فلاں فلاں احکام رُوحانی اور مذہبی معاملات سے تعلق رکھتے ہین

اسلئے زیادہ اہم اور لائق پابندی ہیں، اور فلاں فلاں کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہے، اسلئے ان کی اہمیت بھی کم ہو، یہ تفریق ان کے نزدیک مقام رسالت کی جامعیت سے ناآشنا ہونے کی علامت ہی، کیا اس زمانہ کے کسی بڑے سے بڑے عالم دین نے بھی سنت کی اہمیت پر اس سے زیادہ زور دیا ہی؟

دور جدید کے اکثر روشن خیال "مسلمان اتباع سنت کے لئے اپنی آمادگی تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن انھیں احادیث کی صحت میں کلام ہے، اور چونکہ سنت کی بنیاد تمام تر احادیث ہی پر ہے، اسلئے وہ اپنے کو سنت کی پیروی سے معذور خیال کرتے ہیں، اس فتنہ کی اشاعت بھی مستشرقین یورپ کا ایک نمایاں کارنامہ ہے، مصنف نے اس مسئلہ پر نہایت فاضلانہ بحث کی ہے، اور مستند احادیث کی صحت کو بہت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے، ہم اس بحث کا خلاصہ سطور ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

کسی حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے، کہ اس کے پہلے راوی یعنی کسی صحابی یا بعد کے راویوں میں سے کسی ایک نے قصداً غلط بیانی کی، جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے، ایسی غلط بیانی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، آنحضرت صلعم کی شخصیت کا جس درجہ گہرا اثر صحابہ پر تھا، وہ تاریخی حیثیت سے پوری طرح ثابت ہے، لہذا یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ جو لوگ حضور کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کر دینے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے، وہ آپ کے ارشادات کے ساتھ بددیانتی برتیں گے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ آنحضرت صلعم کا یہ فرمان ان تک پہنچ چکا تھا، من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار، (جو شخص قصداً میرے متعلق جھوٹ بیان کرے اُسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں کرے)

حدیث سے متعلق غلط بیانی کی دوسری وجہ کوئی ذاتی غرض ہو سکتی ہے سو ایسی تمام حدیثوں کو جو مختلف افراد یا جماعتوں کے سیاسی اغراض سے تعلق رکھتی ہیں، اکابر محدثین خصوصاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا ہے، ان حدیثوں کو چھانٹ دینے کے بعد جو ذخیرہ باقی رہ گیا، اوس میں کسی ذاتی منفعت کا شبہہ نہیں ہو سکتا،

کسی حدیث کے مستند نہ ہونے کی ایک تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ ممکن ہے کہ خود راوی اول یعنی صحابی نے یا بعد کے راویوں میں سے کسی ایک نے اُسکے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے یا حافظہ کی خطا سے یا کسی اور نفسیاتی سبب سے اسکی روایت میں غلطی کی ہو، جہانتک اس مسئلہ کے نفسیاتی پہلو کا تعلق ہے، ایسی غلطی کا امکان خصوصاً صحابۂ کرام سے بہت ہی کم ہے، صحابہؓ کیلئے حضور کا ہر ارشاد اور ہر عمل حد درجہ اہمیت رکھتا تھا، نہ صرف آپکی شخصیت کے غیر معمولی اثر کی بنا پر بلکہ اس سبب سے بھی کہ وہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی زندگی کے معمولی جزئیات میں بھی تمام تر اتباعِ رسولؐ ہی کی ہدایت فرمائی ہے، پس وہ آپ کے ارشادات کو محفوظ رکھنے کی تمام امکانی کوششیں کرتے تھے، اور اس مقصد کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہی کہ جو صحابہ آنحضرتؐ کی خدمت میں زیادہ حاضر رہا کرتے تھے، انھوں نے آپس میں دو دو آدمیوں کی ٹولیاں بنائی تھیں، اور ہر ایک باری باری حضور کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا، اور جو کچھ دیکھتا یا سنتا تھا، اُسے اپنے ساتھی سے بیان کر دیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ حضورؐ کے ارشاد و اعمال کے تحفظ کا کسقدر اہتمام کرتے تھے، ایسی صورت میں یہ زیادہ قرین قیاس نہیں، کہ وہ الفاظ حدیث کے تحفظ میں بے پروائی کرتے رہے ہوں، اور پھر اگر ہزاروں صحابہ کیلئے پورے قرآن کو حفظ کر لینا ممکن تھا، اور ہجے کے جزئیات تک اُن کے حافظہ سے فروگذاشت نہیں ہوئے، اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں متفقہ طور پر وہ پورے قرآن کو ضبط تحریر میں لا سکے، تو صحابہ اور تابعین کیلئے یہ بھی ممکن تھا، کہ ارشادات نبوی کو بغیر گھٹائے بڑھائے اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیں، علاوہ بریں محدثین صرف اُنھی حدیثوں کو کامل طور پر صحیح قرار دیتے ہیں، جو ایک ہی طرح سے مختلف سلسلۂ رواۃ میں بیان کی گئی ہیں، اسمیں شبہہ نہیں کہ صحیح حدیثوں کے ساتھ بے شمار موضوع حدیثیں بھی شامل ہو گئی ہیں، لیکن ان کی چھان بین ہمیشہ ہوتی آئی ہے، اور محدثین نے اُن کی تفتیش و تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، علی الخصوص امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے احادیث کی جانچ میں جرح و تعدیل کا کوئی ذرہ باقی نہیں چھوڑا، چنانچہ یہ اسی کاوش کا نتیجہ ہے، کہ رواۃ حدیث کی تحقیق میں اسماء الرجال کا ایک مستقل فن مرتب ہو گیا، محدثین نے صرف اُنھی حدیثوں کو لیا ہے جنکے راوی انکے قائم کردہ معیار میں پورے اُترے، اور وہ

معیار اسقدر سخت تھا کہ کسی روایت کی تحقیق میں اُس سے زیادہ سخت معیار قائم کرنا ممکن ہی نہیں،

مذکورۂ بالا بحث کے بعد فاضل مصنّف دعوی کرتے ہیں، کہ اسوقت تک کوئی ناقد یہ ثابت نہیں کر سکا ہے، کہ جو حدیثیں اکابر محدثین کے معیار صحت کے مطابق صحیح قرار دی جاچکی ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اور پھر فرماتے ہیں، کہ جو مسلمان آج حدیثوں سے انکار کرتے ہیں، وہ ایک خاص سبب سے ایسا کرتے ہیں، وہ اپنی پست ذہنیت اور ذلیل طرزِ معاشرت کو روحِ اسلام سے جو سنتِ رسول میں پائی جاتی ہے، کسی طرح مطابقت نہیں دیکھتے، اسلئے بجائے اسکے کہ اپنے اور اپنے ماحول کے نقائص کو دور کریں، وہ اتباع سنت کی پابندی ہی سے آزاد ہوجانا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوجائے تو وہ تعلیماتِ قرآن کی تفسیر اپنے خاطر خواہ "عقلیت" کے سطحی طریقہ پر کر سکیں گے، اور ہر شخص اپنی طبیعت اور اپنی رائے کے مطابق قرآن کے معنی بیان کر سکے گا، علاوہ بریں مسلمانوں کی موجودہ نسل مغربی تہذیب کی ترقی سے مرعوب ہوکر اسکی ہرادا کی دلدادہ ہورہی ہے، اور اُسے اختیار کرنے کی بجز اسکے کوئی صورت نہیں، کہ احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دے کر سنت ہی سے آزادی حاصل کرلی جائے، جس کے بعد قرآن کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر مغربی تہذیب کے مطابق کرلینا آسان ہوجائے گا،

مخالفین اسلام کی طرف سے یہ ایک بہت قدیم اعتراض چلا آتا ہے، کہ اتباعِ سنت کی سختی کے ساتھ پابندی کرنا انسان کی آزادی پر ایک روک عائد کر دیتا ہے، جس سے سوسائٹی کی فطری ترقی محدود ہوجاتی ہے، چنانچہ معترضین نے مسلمانوں کے انحطاط کا ایک بڑا سبب اتباعِ سنت ہی کو قرار دیا ہے، فاضل مصنّف اس اعتراض کا جواب دیتے ہوے فرماتے ہیں، کہ فہم انسانی سختی کے ساتھ محدود ہے، اور ہمارا دماغ اپنی فطرت کے لحاظ سے کلیت کے تخیل کا احاطہ کرنے سے قاصر، ہم تمام چیزوں کے جزئیات ہی کو سمجھ سکتے ہیں، لہذا اس مذہب کے مسائل میں جو فوق العقلی بنیادوں پر قائم ہے، ہمیں لابدی طور پر ایک ایسے ہادی کی ضرورت ہے، جس کا دماغ انسانی دماغوں سے فائق اور جس کا قلب انوارِ الٰہیہ سے معمور ہو، یعنی ہمیں ایک نبی کی ضرورت ہے، جو ہماری ہدایت کیلئے مبعوث ہوا ہو، پس اگر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ قرآن خدا کا کلام ہے، اور محمد صلعم خدا کے رسول تھے، تو ہم نہ صرف اخلاقی بلکہ

عقلی حیثیت سے بھی آپ کی ہدایتوں پر بے چون وچرا عمل کرنے کیلئے مجبور ہیں، یہ صحیح ہے، کہ حضورؐ کے بعض احکام مذہبی طور پر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، اور بعض ایسے ہیں، جنکی اہمیت مقابلۃً کم ہے، ہمیں چاہیے کہ جو زیادہ اہم ہیں، ان کو کم اہمیت والوں پر مقدم سمجھیں، لیکن ہمیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے، کہ اُن میں سے کسی ایک کو بھی غیر ضروری سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتیں، کیونکہ آپ کا ہر حکم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہے،

اس اعتراض کے علاوہ مخالفین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اب محض ایک "زائل شدہ قوت" ہے، اور دنیا کو جو کچھ فائدہ اس سے پہنچ سکتا تھا، وہ اب سے پہلے پہنچ چکا، اس رائے سے وہ مسلمان بھی متفق ہیں، جو تہذیب جدید سے مغلوب ہوچکے ہیں، اور اپنے اندر مقابلہ کی جرأت بالکل نہیں پاتے، اُن کے نزدیک دنیا کے اور تمدنوں کی طرح اسلامی تمدن کا دور عروج بھی ختم ہوگیا، اور اب اس کے انحطاط وزوال کا زمانہ ہے جو ہر تہذیب و تمدن کو ایک وقت قدرتی طور پر پیش آتا ہی، لہذا ایسی حالت میں تمام جد وجہد بے سود ہے، فطرت کا قانون عروج وزوال بدل نہیں سکتا، اور اسلامی تمدن کی تباہی بھی ناگزیر ہے،

لیکن مصنف کی قوتِ ایمانی اس تاریخی دلیل سے قطعی مرعوب نہیں ہوتی، وہ اسلام کو اس کلیہ سے مستثنیٰ سمجھتا ہے، اور اعلان کرتا ہے، کہ اگر اسلامی کلچر ایک ایسے قانون کی پیروی کا نتیجہ ہے، یا تھا، جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، تو ہم ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے، کہ دوسرے کلچروں کی طرح یہ بھی مرور زمانہ کے ساتھ وابستہ اور قوانین حیات عضویہ کے ساتھ محدود ہے، جو چیز بظاہر اسلام کی موت معلوم ہوتی ہے، وہ ہمارے دلوں کی موت اور تہی مایگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں، جو اپنی شدتِ سستی کی وجہ سے دائمی آواز کو سننے سے قاصر ہیں، اس بات کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، کہ انسان اپنی موجودہ حالتِ عروج میں اسلام سے مستغنی ہوگیا ہے، وہ اسلام کے پیش کردہ نظام اخلاق سے بہتر کوئی نظام پیش نہیں کر سکا، وہ اخوتِ انسانی کے تخیل کو کسی عملی بنیاد پر قائم نہیں کر سکا، جیسا کہ اسلام نے اپنے فوق الملی تخیل "امت" میں کر دکھایا ہے، وہ کوئی ایسا معاشرتی نظام پیدا نہیں کر سکا جس میں افراد کے باہمی تنازعات و مناقشات اس حد تک کم ہوجائیں، جس حد تک اسلام کے معاشرتی نظام نے کم

کر دیا ہے، وہ انسان کی قدر و منزلت اسکے احساس امن و سلامتی، اسکی امید روحانی، اور سب آخر لیکن یقیناً سب کمتر نہیں، اسکی مسرت کو ترقی نہیں دیگا"

آج جب کہ ہر روشن خیال "مُصلح" جس کے مُنہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم ہو، اسلام کی "اصلاح" کیلئے بیقرار نظر آرہا ہے، مناسب ہے، کہ ایک خالص یوروپین اور تہذیب جدید کی گود میں پرورش پائے ہوئے شخص کی رائے بھی اس باب میں سُن لیجائے، :۔

"ہمارے لئے اسکی ضرورت نہیں ہے، کہ اسلام کی "اصلاح" کریں جیسا کہ بعض مسلمانوں کا خیال ہو، کیونکہ اسلام پہلے ہی سے کامل اور مکمل ہے، ہمیں جس چیز کی اصلاح کرنیکی ضرورت ہو، وہ مذہب کی نسبت ہمارا رویہ، ہماری سستی، ہماری خود پرستی، ہماری کوتاہ نظری، مختصر یہ کہ خود ہمارے نقائص ہیں نہ کہ اسلام کے بعض مفروضہ نقائص، اسلام میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کیلئے ہمیں باہر کے جدید اصول عمل کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف قدیم اور چھوڑے ہوئے اصولوں ہی کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے، بلا شبہہ ہم غیر تمدنوں سے نئی قوت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اسلام کے مکمل نظام کو کسی غیر شے سے خواہ وہ مغربی ہو، خواہ مشرقی بدل نہیں سکتے، اسلام بحیثیت ایک روحانی اور اجتماعی نظام کے بہتر نہیں بنایا جا سکتا"

جان لاک؎ کا فلسفہ

سنہ ۱۶۳۲ء — سنہ ۱۷۰۴ء

از جناب سیّد منظور احمد صاحب ایم اے (علیگ) پٹنہ

ہمارے سارے علوم اور معلومات کی بنیاد ہمارے ذہنی تصورات پر ہے، یہ تصورات کیا تمام تر بدیہی ہیں؟ اور یہ ہمکو فطرت کی طرف سے از خود ملے ہیں، یا یہ بھی ہمارے کسب و استدلال اور خارجی تجربوں سے حاصل ہوئے ہیں، ان سوالوں کے جواب میں مختلف فلسفیوں نے مختلف نظریے پیش کئے ہیں، لاک یہ کہتا ہے کہ بدیہی تصورات کوئی چیز نہیں، نیز یہ کہ ہمارے ذہنی تصورات خارجی محسوسات سے ماخوذ ہیں، ذیل کی تحریر میں انھی دو باتوں کی تشریح کی گئی ہے، "معارف"

جان لاک دوسرے انگریز فلسفیوں کی طرح اثباتی (Positivistic) رجحانات کا بہت بڑا حامی ہے، طب کے مطالعہ کی راہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا، کہ یورپ کے عہد وسطیٰ کے اکثر علوم جنکی نشو و نما کلیسا کی چار دیواری کے اندر ہوئی تھی، بے سود اور لاحاصل ہیں، اس کا خیال ہے کہ افلاطون کے مابعد الطبعیات، اخلاقیات، اور الٰہیات کے بدیہی (a priori) قوانین حقیقت سے روشناس ہونے میں بڑی حد تک مانع ہیں، دور جدید میں بھی بدیہیات کے متعلق بلند پروازیوں کی بدعت ڈیکارٹ (Descartes) نے جاری رکھی،

اگر ادراک حقیقت کیلئے ذہن خارجی عالم کا محتاج نہیں، تو مشاہدہ اور تجربہ بیکار ہے، ریاضی کی طرح طب میں بھی تجربہ کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے، لیکن یہ واقعہ ہے، کہ اسمیں بغیر تجربہ کے مفر نہیں ڈیکارٹ نے فلسفہ اور الٰہیات

؎ John Locke 1632-1707

کے بحث میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو بند کرلیا، اور تمامتر بدیہیات سے نتائج حاصل کئے، لیکن یہ بلند پروازیاں اس وقت ختم ہوجاتی ہیں جب وہ جسمانیات کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہو، کلیسا کی مابعد الطبعیات کا بھی یہی طریقہ تھا، کہ عالم خارجی سے قطع نظر کرلیا جائے، اور ذہن یا روح انسانی کو تمام خیالات کا مبدء سمجھا جائے،

اسلئے فلسفیوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے یہ ثابت کرنا ضروری ہوا کہ ہمارے خیالات عالم خارجی کے رہین منت ہیں، اس موضوع پر لاک نے ایک کتاب عقل انسانی کے متعلق "(Essay Concerning Human understanding) لکھی یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، جس کا خاتمہ کانٹ (Kant) کی تنقید (Critique) نے کیا،

اس کتاب میں حسب ذیل مسائل کے متعلق بحث ہے،

۱۔ خیالات کا مبدء کیا ہے،؟

۲۔ علم کی وسعت کہاں تک ہو؟ اور کہاں تک وہ یقینی ہے،؟

۳۔ فلسفہ کو مجبور کرنا کہ وہ ان مباحث کو ترک کرے، جو یقینی طور پر ہمارے علم کی حد سے خارج ہیں،

خیال پرستی (Idealism) کے خلاف اس کا انقلاب انگیز جہاد اسلئے تھا کہ بدیہی علوم کی کوئی حقیقت نہیں، ظاہر ہے، کہ نوزائیدہ بچے، بہتیرے غبی آدمی، اور بیشمار جہلا کو ان اولیات (axioms) کے متعلق کچھ خبر نہیں ہوتی، جو بدیہی کہے جاتے ہیں، بدیہی تصورات (Ideas) کے حامی یہ کہتے ہیں، کہ ذہن میں ایسے تصورات موجود ہوسکتے ہیں، جن کا شعور (Consciousness) نہ ہو، لیکن یہ کہنا کہ تصور ذہن میں موجود ہے، درانحالیکہ اس کا شعور نہیں مہمل ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ ایک چیز ذہن میں ہو بھی اور نہیں بھی ہو اسلئے کہ شعور ذہن انسانی کا خاصہ ہے، اور وہ چیز جس کا شعور نہ ہو، ذہن میں نہیں پائی جاسکتی،

یہ سچ ہے کہ بعض تصورات کا علم بہت پہلے سے ہوتا ہے، لیکن اگر ہم غور کریں تو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوجائے گی، کہ ان حقائق کا علم کسبی (Acquired) ہو، وہبی (Innate) نہیں، ہم بتدریج تصورات حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد ان کو دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے ان کے نام رکھتے ہیں، اور اس کے

بعد ان کے مابین جو تعلقات ہیں، ان کو سمجھتے ہیں، اگر تمام عالم انسانی کسی حقیقت کا معترف ہے، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت بدیہی ہے، ایسے حقائق کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسرے شخص کی زبانی سنے جائیں، حالانکہ اگر وہ بدیہی ہیں، تو محتاج سماعت کیوں ہیں، یہ کہنا کہ ایک حقیقت بدیہی بھی ہو اور نامعلوم بھی صریح متناقض اور غیر معقول ہے،

اخلاقیات کے اصول بھی دوسرے علوم کی طرح بدیہی نہیں، اسلئے کہ مسرت کی تمنا اور تکلیف سے تنفر ہمارے اندر موجود ضرور ہے لیکن یہ کسی ایسی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا، جو ذہن میں پہلے سے منقوش ہو، بلکہ یہ طبیعت انسانی کے رجحانات ہیں، مزید براں اخلاقیات کا کوئی ایسا اصول نہیں، جس پر ساری دنیا متفق اور کاربند ہو خدا کا تصور اور اخلاق کے قوانین مختلف قوموں میں مختلف ہیں، سچ بولنے کے متعلق بھی اگر پوچھا جائے تو خدا کے ماننے والے یہ کہیں گے، کہ سچ بولنا خدا کا حکم ہے، اور دائمی سزا یا جزا، خدا کے ہاتھ میں ہے، لیکن مادہ پرست، (Materialist) یہ جواب دیں گے، کہ سچ بولنا اسلئے ہم پر فرض ہے، کہ رائے عامہ (Public opinion) ہم سے اسکی توقع کرتی ہے، بخلاف اسکے فلسفی ایک تیسرا جواب دے گا، وہ کہے گا کہ انسان کے علو مرتبت کے شایان شان نہیں کہ وہ جھوٹ بولے، اخلاقیات والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ضمیر (Conscience) اخلاق کے قوانین کے توڑنے پر ملامت کرتا ہے لیکن ضمیر دراصل اپنے عمل پر اپنے نفس کی رائے ہے، اگر ضمیر بدیہی اصول کی دلیل ہوتا، تو یہ اصول متضاد نہ ہوتے، کیا یہ واقعہ نہیں کہ جنگلی اور وحشی قومیں ان بری بری جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں، جنکو سنکر ہر مہذب شخص کانپ اٹھتا ہے، لیکن وہ خود ان حرکات پر منفعل ہونے کے بجائے فخر کرتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ کسی اخلاقی قانون کا توڑنا، اس کے عدم واقفیت کی دلیل نہیں، لیکن یہ خیال کرنا کس قدر بعید از قیاس ہے، کہ ساری کی ساری قوم علانیہ اس قانون سے انحراف کرے جس کا علم بدیہی اور لازمی طور پر ہر فرد کو ہو، یہ بھی ظاہر ہے، کہ اخلاق کے عملی قوانین کو بدیہی کہدینے سے یہ الزام آتا ہے، کہ اخلاق کی تعلیم کی قطعاً حاجت نہیں، اسلئے کہ ہر متنفس کو

خود ہی اس کا علم ہوگا،

اس سلسلہ میں یہ بھی قابل غور ہو کہ بعض وہ تصورات جنکی ابتدا، بوڑھی عورتوں کی توہم پرستی سے ہوتی ہے، کسطرح مرور زمانہ اور عوام کی پذیرائی سے آخر میں مذہب یا اخلاق کے اہم قوانین کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں، بچوں کا ذہن سادہ کاغذ کی طرح ہوتا ہے، اور ان پر جس قسم کے نقوش ہم کھینچنا چاہیں، کھینچ سکتے ہیں، جب بچے سن شعور کو پہنچتے ہیں اور اپنے علم کا جائزہ لیتے ہیں، توان کو یہی توہمات قدیم ترین نظر آتے ہیں، اور خارجی طور پر ان کو ان کی کوئی مثال اور علت نظر نہیں آتی، اسلئے وہ سمجھتے ہیں کہ خدا یا فطرت نے یہ تصورات ان کے ذہن میں شروع ہی سے منقوش کردئے ہیں، اسلئے یہ بدیہی ہیں،

مزید برآں ایسی حقیقت جو قضیہ (Proposition ، (جملہ) کی صورت میں ہو کیونکر بدیہی ہو سکتی ہے، جب کہ وہ تصورات جو اس قضیہ کے اجزا ہیں بدیہی نہیں، کسی قضیہ کے بدیہی ہونے کیلئے بعض تصورات کا بدیہی ہونا لازمی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نوزائیدہ بچے میں بظاہر سوائے بھوک پیاس اور لذت والم کے احساس کے اور کسی تصور کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، خدا کا تصور بھی بدیہی نہیں، ملحدوں کے علاوہ ایسی قومیں بھی ہیں، جن میں خدا کا کوئی تصور نہیں، اور نہ اس کے لئے ان کی زبان میں کوئی اصطلاح ہے، اس کے علاوہ خدا کا تصور مذہب تشبیہ (anthropomorphism) سے لیکر فلسفیوں کی اعلیٰ الٰہیات (Theology) تک اسطرح بدلتا ہے، کہ ایک کو دوسرے سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی، اور اگر کسی تصور کا عام اور یکساں ہونا ہی اسکی بدیہیت کی دلیل ہے، تو غالباً خدا کا تصور آگ کے تصور سے زیادہ عام نہیں، اسلئے کہ ایسا کوئی بشر نہیں، کہ جسکو خدا کا تصور ہو، اور آگ کا تصور نہ ہو،

ذہن یا نفس انسانی ابتداءً سادہ تختہ کی طرح ہوتا ہے، ہمارے تمام تصورات کی بنا اور سارے علوم کا ذریعہ مشاہدہ (Experience) ہے، تصورات دو ذرائع سے ہمارے ذہن میں آتے ہیں، ایک حس (Sense) جس سے عالم خارجی کا شعور ہوتا ہے، اور دوسرے وجدان (Reflection) جسکے

ذریعہ اندرونی کیفیات کا علم ہوتا ہے، ذہن میں ایک تصور بھی ایسا نہیں ہوتا جو ان دو کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے آیا ہو، بچے کے ابتدائی تصورات کا ذریعہ حواس ہیں، جب وہ کچھ بڑا ہوتا ہے، تو اسے اپنی داخلی کیفیات کا علم ہونے لگتا ہے، اس دعوے کی دلیل بہت کچھ لسانیات سے ملتی ہے، جتنے الفاظ بھی ہم استعمال کرتے ہیں، محسوس تصورات پر مبنی ہیں، وہ الفاظ بھی جو ایسے افعال اور خیالات کے حامل ہیں، جن کا تعلق حواس سے بہت دور کا ہے، یا بظاہر کچھ بھی تعلق نہیں محسوس تصورات سے لئے گئے ہیں، اسمیں شک نہیں کہ بتدریج ان کی صورت بدلتی جاتی ہے، اور آخر میں ان کو محسوس تصور سے منسوب کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، مثلاً روح خود ایک غیر محسوس شے ہے، لیکن ریح (ہوا) سے ماخوذ ہے، جو ایک محسوس شے ہے، اسی طرح ملک الک (پیغام بھیجنا) سے ماخوذ ہے، یا فرشتہ (فرستہ) فرستادن سے لیا گیا ہے،

اگر ہم ہر لفظ کے مادہ اور ترکیب پر غور کریں اور ان کے معنی کے عہد بعہد کے تغیر کو دریافت کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ ان کی ابتدا کسی نہ کسی محسوس تصور سے ہوئی ہے، بچے کی کیفیات کا اسکی پیدائش کے وقت سے مطالعہ کیا جائے، تو صاف معلوم ہوگا، کہ جوں جوں ذہن حواس کے ذریعہ سے تصورات حاصل کرتا جاتا ہے، اسمیں غور و فکر کا مادہ بڑھتا جاتا ہے، اسلئے کہ حواس فکر کیلئے مواد بہم پہنچاتے ہیں، ہم اس وقت تک غور و فکر نہیں کرسکتے ہیں، جبتک ہمارے پاس محسوس تصورات نہ ہوں، اور ذہن میں صرف وہی چیزیں ہو سکتی ہیں، جن کا مشاہدہ ہو چکا ہو، خیال پرستوں کے نزدیک، خیال نفس کا خاصہ ہے، اسلئے یہ ناممکن ہے کہ نفس میں کسی وقت بھی خیال نہ ہو، اور محسوسات سے پہلے، اور ان سے بالکل الگ رہنے پر بھی نفس غور و فکر کرتا رہتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ نفس خیال کرتا رہتا ہے اور یہ ممکن ہے، کہ بعض اوقات اسکو اس کا شعور نہ ہو، لیکن تجربہ ہی اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہے، اور وہ اس دعوی کی تائید نہیں کرتا، نفس کیلئے ہمہ دم فکر کرنا اسی طرح ضروری نہیں جسطرح کہ جسم کیلئے ہر وقت حرکت کرنا، خیال کا دائمی تسلسل ایسا نظریہ ہے، جس کا ہمارے تجربہ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، آدمی فکر نہیں کرسکتا جبتک کہ اسکو اسکا شعور بھی نہ ہو، اگر یہ سچ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آدمی ہر وقت بھوکا رہتا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اسکو

محسوس نہیں کرتا،

تخیل تمامتر حواس پر مبنی ہے، تخیل کی اعلیٰ سے اعلیٰ بلند پروازیوں اور تصور کی انوکھی سے انوکھی جولانیوں میں بھی ہم اس حد سے باہر نہیں جاتے، جو ہمارے حواس یا وجدان نے متعین کئے ہیں، ایسے موقع پر عقل بالکل مجبور ہوتی ہے، محسوس اشیا اپنے تصورات ہمارے ذہن پر نقش کردیتی ہیں، خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، یہ مفرد تصورات جب ذہن کو پیش کئے جاتے ہین، تو نفس نہ ان سے انکار کرسکتا ہے، نہ ان میں کوئی تغیر کرسکتا ہے، اور نہ انھیں مٹا سکتا ہے اسکی حالت بالکل آئینہ کی سی ہوتی ہے، جو سامنے رکھی ہوئی چیز کا عکس قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے،

تصورات دو قسم کے ہوتے ہیں، مفرد (Simple) اور مرکب (Complex)

تمام علم کی بنیاد میں جو ذہن میں مندرجۂ بالا دو ذرائع سے آتے ہین، مفرد تصورات کیلئے ذہن مجبور ہوتا ہے، لیکن مرکب تصورات کے معاملہ میں ایک حد تک مختار ہوتا ہے، اول الذکر ذہن خود بناتا ہے، جب ذہن مین مفرد تصورات آجاتے ہیں تو اس کو اختیار ہوتا ہے کہ انکی تکرار کرے، ان میں مقابلہ کرے، یا ان مین امتزاج کرے، اور ان کی صورتیں بے شمار طور پر بدلی جاسکتی ہیں، جن کے نتائج مرکب تصورات ہوتے ہیں، لیکن یہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ کی قدرت سے باہر ہے کہ ایک بھی نیا مفرد تصور خود بنالے، عالم خیال مین بھی انسان کا احاطۂ قدرت اسی قدر ہے کہ جتنا کہ عالم خارجی (اشیاء محسوس کی دنیا) مین یہاں بھی علم و فن کی ندرت وجدت اشیا کی تقسیم اور ترکیب پر محدود ہے، وہ اس پر قادر نہیں کہ ایک ذرہ کا بھی اضافہ کرسکے یا اسے معدوم کرسکے،

مفرد تصورات ذہن مین ایک حس کے ذریعہ یا اُس سے زیادہ حواس کے ذریعہ یا محض وجدان سے، یا حواس اور وجدان دونوں سے آتے ہین، اُن تصورات مین سے جو صرف ایک حاسہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں (رنگ آواز، مزہ، بو وغیرہ) کوئی تصور ایسا نہیں جو ٹھوس پن (Solidity) سے زیادہ متواتر ہمارے ذہن کو پیش ہوتا ہو، یہ تصور لمس (Touch) کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اور اوس کو تمام مفرد تصورات سے زیادہ جسم سے گہرا تعلق ہے، ٹھوس پن نہ مکان (SPACE) ہے جسکو دیکارٹ غلطی سے مترادف سمجھتا ہے، اور نہ یہ سنگینی (HARDNESS)

اس میں اور مکان میں وہی فرق ہے، جو تصادم (Resistance) اور غیر تصادم میں جسم کے ٹھوس ہونیکے معنی یہ ہیں، کہ وہ اس مکان کو بھردے، جسمیں وہ ہو اور پھر اسمیں دوسرے جسم کی گنجایش نہ چھوڑے، اور سنگینی سے یہ مراد ہے، کہ آسانی سے اپنی شکل نہ بدلے،

مندرجۂ بالا بیان جو لاک ٹھوس پن کے متعلق پیش کرتا ہے، اسکی منطقی تعریف نہیں، اگر اس سے پوچھا جائے، کہ ٹھوس پن کی تعریف کیا ہے، تو وہ یہ کہے گا کہ اپنے حواس سے اسکے متعلق واقفیت حاصل کرو، ہمارے مفرد تصورات ایسے ہی ہوتے ہیں، جیسا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے، لیکن اگر ہم چاہیں، کہ ذہن میں اسکو اور واضح اوصاف کریں، تو ہم کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتے،

جن تصورات کیلئے ایک حاسہ سے زیادہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مکان، شکل، حرکت اور سکون کے تصورات ہین، وجدان کے ذریعہ تخیل اور ارادہ وغیرہ کے تصورات حاصل ہوتے ہیں، لذت والم قوت اور وجود وغیرہ کے تصورات حواس اور وجدان دونوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہین،

ہمارے احساسات کی بعض خارجی علتیں حقیقی (Real) اور وجودی (Positive) ہیں اور بعض محض عدمی (Privations) جیسے ٹھنڈک اور اندھیرا وغیرہ جب ذہن کو ان تصورات کا شعور ہوتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ دوسرے تصورات کی طرح ہین، اور وجودی ہیں، اور ان کی علت کی طرف توجہ نہیں کرتا ہے، جس کی تحقیق تصور سے متعلق نہین ہے، بلکہ حقیقت اشیاء سے جو موجود فی الخارج ہیں، اور یہ دونوں بالکل مختلف چیزین ہین، ان کو ہمیشہ بین بین رکھنا چاہئے، ہمکو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہمارے تصورات کسی ایسی چیز کے جو اس شے میں مضمر ہے، جو تصور کی علت ہو، مشابہ یا مماثل ہیں، کیونکہ بیشتر حواس کے تصورات جو ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں، اس چیز سے مشابہ نہین ہوتے، جو موجود فی الخارج ہے، جسطرح چیزوں کے نام ہمارے تصورات کی تصویر نہیں ہوتے، حالانکہ ان ناموں کے سننے سے ہمارے ذہن مین بعض تصورات آجاتے ہیں، (اُبھر آتے ہیں)

ذہن کو حواس کے ذریعہ جو شعور ہوتا ہے، لاک اسکو تصور کہتا ہے، اور اس چیز کو جو اس تصور کو ہمارے

ذہن میں پیدا کرتی ہے، صفت (Quality) کہتا ہے، لاک کے نزدیک صفات دو قسم کی ہیں،

۱۔ ٹھوس پن، شکل، حرکت، وغیرہ جو جسم سے غیر منفک ہیں، خواہ وہ کسی حال میں ہو، اور باوجود تغیر کے بھی ان صفات کا حامل رہتا ہے، یہ اصلی یا اوّلی (Primary) صفات ہیں،

۲۔ رنگ، آواز، مزہ، وغیرہ، یہ صفات خود جسم میں نہیں ہوتیں، بلکہ یہ ایک قسم کی قوت ہیں، جنکے ذریعہ اوّلی صفات ہمارے ذہن میں احساسات پیدا کرتی ہیں، یہ صفات غیر محسوس اجزاء کی شکل، ٹھوس پن، حرکت کے تغیر کا نتیجہ ہوتی ہیں، لاک انھیں ثانوی صفات (Secondary) کہتا ہے، صفات اسلئے کہ عرف عام میں سُرخ و سفید میٹھا اور نمکین وغیرہ جسم کی خاصیت سمجھے جاتے ہیں، اور ثانوی اسلئے کہ انھیں حقیقی صفات سے متمائز کرے، یہ ثانوی صفات محض احساسات ہیں جو ذہن میں اوّلی صفات پیدا کرتی ہیں، یہ احساسات ہیں جو کسی طرح بھی ان صفات کے مشابہ نہیں، جو اشیاء میں موجود ہوتی ہیں، تصور میں جو میٹھا، نیلا یا گرم ہوتا ہے وہ در اصل شکل اور حرکت ہے خود جسم کے ان اجزاء کی جن کا ہم یہ نام رکھتے ہیں، فرض کیجیے کہ ہم ان صفات کو محسوس نہ کریں، یعنی آنکھیں بند کرلیں، پھر رنگ اور روشنی کا وجود کہاں رہتا ہے، اور کان بند کرلیں، تو آواز کہاں رہتی ہے، اسی طرح ذائقہ اور شامہ اگر نہ ہو، تو مزہ اور بو بھی نہ ہو، اگر انسان کے حواس بہت لطیف اور نفیس ہوتے اور مختصر اجزاء جن پر محسوس صفات کا انحصار ہے، معلوم ہوتے، تو بالکل مختلف قسم کے تصورات پیدا ہوتے، اسکا ثبوت خوردبین سے ملتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ خون جراثیم کا مجموعہ ہے، جنمیں سُرخ جراثیم کی تعداد نسبۃً بہت کم ہے، اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر اس سے ہزار یا لاکھ گونہ قوت والا خوردبین ہو تو پھر یہ جراثیم کیسے نظر آئیں گے،

تصورات کے حاصل کرنے اور انکی ترکیب و ترتیب کیلئے حسب ذیل قوتوں کا ہونا ضروری ہے،

۱۔ احساس (Perception) (یا ادراک) جو علم کا پہلا زینہ اور اس کے تمام مواد کے درآمد کا دروازہ ہے،

۲۔ حافظہ (Retention) جو تصورات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے، اور دوبارہ ان تصورات کو بوقت ضرورت پیش کرتا ہے،

۳۔ امتیاز (Discernment) جنکے ذریعہ مختلف تصورات کو ہم الگ الگ پہچانتے ہیں،

۴۔ موازنہ (Comparison) جس سے ہم ایک تصور کا دوسرے تصور سے تعلق معلوم کرتے ہیں،

۵۔ ترکیب (Composition) جس سے مفرد تصورات کو ملاکر مرکب تصورات بناتے ہیں،

۶۔ تجرید، (abstraction) اگر ہر تصور کیلئے ایک خاص نام رکھا جاتا تو الفاظ کی تعداد لامحدود ہوجاتی، اسکو روکنے کے لئے ذہن خاص تصورات سے عام تصورات بناتا ہے، یہ اشیاء کی ان صفات کو جو انھیں خاص بناتی ہیں، الگ کردیتا ہے، اور ان کی ایسی صفات کو جو دوسری اشیاء اور دوسرے تصورات میں مشترک ہوں، ملاکر ایک عام تصور بنالیتا ہے، ذہن کے اس فعل کو تجرید کہتے ہیں، اور یہ ذہن انسانی کیلئے مخصوص ہے، حالانکہ ماقبل قوتیں انسان اور حیوان میں مشترک ہیں،

احساس کے وقت ذہن مجبور ہوتا ہے، لیکن اسکے بعد جوں جوں وہ دوسرے زینوں پر قدم رکھتا جاتا ہے، اس کا اختیار بڑھتا جاتا ہے، موازنہ ترکیب اور تجرید ذہن کے اعلیٰ افعال ہیں، لیکن مرکب تصورات کے بنانے میں ذہن کو کتنا ہی اختیار کیوں نہ ہو جب اسکے مواد کا تجزیہ کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ یہ وہی احساسات ہیں، جنکے معاملہ میں ذہن بالکل مجبور ہے، اسی طرح مکان، شکل اور فصل مفرد تصورات کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، جو حواس خمسہ کے رہین منت ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ ہمیشگی لامحدودیت وغیرہ کا تصور کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ ہمارے گرد و پیش کی اشیاء کوئی بھی ایسی نہیں، تو لاک جواب دیتا ہے، کہ یہ تصورات عدمی ہیں، ہمیں در اصل نہ لامحدود مکان کا تصور ہوتا ہے، اور نہ غیر محدود زمان کا، ہمارے تمام وجودی تصورات محدود ہوتے ہیں، لامحدود زمان و مکان کا عدمی تصور ذہن اسطرح حاصل کرتا ہے، کہ زمان و مکان کے تصورات کو بیشمار طور پر مضاعف کرتا ہے،

اضطراری اور اختیاری قوتوں کا تصور اس طرح ہوتا ہے، کہ ایک طرف تو اشیاء میں مسلسل تغیر کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف ہمارے تصورات کا دائمی تغیر معلوم ہوتا ہے، جو بعض وقت خارجی اشیاء کی وجہ سے ہوتا ہے، اور بعض وقت اپنے ارادہ کی وجہ سے،

جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ ذہن ایک تصور کو دوبارہ پیدا کرسکتا ہے، یا اوسے محو کرسکتا ہے، یا جسم کے مختلف اعضا

ین سے کسی ایک کو اپنی خواہش کے مطابق حرکت میں لاسکتا ہے، تو ارادہ کا تصور حاصل ہوتا ہے، ارادہ ضرورت نہیں، بلکہ پابندی کے متضاد ہے، آزادی ارادے کی صفت نہیں، ارادہ ایک قوت یا صلاحیت ہے، اور آزادی بھی ایک قوت ہے، اس لئے یہ کہنا کہ آدمی کا ارادہ آزاد ہو گویا یہ کہنا ہے کہ ایک قوت کو دوسری قوت حاصل ہے، یا ایک صلاحیت مین دوسری صلاحیت ہے، ارادہ کو آزاد کہنا بالکل ایسا ہی ہے، جیسا نیند کو تیز رو یا نیکی کو گول کہنا، ہم ارادہ کرنے میں آزاد نہیں، ہم اس پر مختار نہیں کہ کسی چیز کے متعلق جو ہمارے اقتدار مین ہے، ارادہ کرین یا نہ کریں جبکہ ہم اس طرف متوجہ ہوچکے، ارادہ ذہن کا پابند ہے، اور ذہن مسرت کی خواہش کا پابند، اس معاملہ میں لاک، لائبنز (Leibnitz) اور اسپنوزا (Spinoza) متفق ہیں، اور دیکارٹ اس رای کا مخالف ہے،

مرکب تصورات کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ صفات (modes) کے متعلق جیسے دوستی، جھوٹ، احسان وغیرہ،

۲۔ مادہ (Substance) یا جوہر کے متعلق جیسے، آدمی، گھوڑا، درخت وغیرہ، ذہن مشاہدہ کرتا ہے کہ چند مفرد تصورات مختلف حواس کے ذریعہ ہمیشہ ساتھ ذہن میں داخل ہوتے ہیں، اسلئے تصورات کے اس مجموعہ کو ایک شے قرار دیتے ہیں، اور اس کا ایک نام رکھتے ہین، جوہر یا مادہ مفرد تصورات کے ایسے مجموعے کا نام ہے جو ہمیشہ ساتھ ہوں، آفتاب صرف روشنی، گرمی، گولائی، اور مسلسل حرکت کے تصورات کا مجموعہ ہے، مادہ سے دیکارٹ ایک نامعلوم شے مراد لیتا ہے، اور اس کا یہ خیال ہے کہ مادہ میں وہ صفات ہوتے ہیں، جو ہم میں مفرد تصور پیدا کرتے ہین، اور مادہ وہ چیز ہے، جس پر ان صفات کا انحصار ہے، لیکن مادہ کو مجموعۂ صفات کے علاوہ کچھ سمجھنا یا یہ خیال کرنا کہ صفات کے پردہ میں کوئی چیز پوشیدہ ہے، محض واہمہ کی خلاقی ہے، ہم صفات سے الگ کسی ایسے جوہر کا تصور نہیں کر سکتے، اگر کسی سے پوچھا جائے، کہ رنگ اور وزن کس چیز میں ہین، تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھوس طول و عرض میں، اگر اس سے پھر دریافت کیا جائے، کہ ٹھوس پن کس چیز میں ہے، تو اسکی حالت اس شخص سے بہتر ہوگی جس نے یہ کہا تھا کہ دنیا کو ایک ہاتھی اٹھائے ہوئے ہے، جب اس سے پوچھا گیا کہ ہاتھی کس پر قائم ہے، تو اس نے کہا کہ ایک بہت بڑے کچھوے کی پیٹھ پر، جب اس

سے پھر پوچھا گیا، کہ کچھوے کے نیچے کون چیز ہے، تو اس نے جواب دیا کہ کچھ ہو ہی گا لیکن مجھے اسکی خبر نہیں" ہمارا علم صفات کی حد سے باہر نہیں جاسکتا یعنی صرف مفرد تصورات پر منحصر ہے، اور جب بھی مابعد الطبیعیات والے اس سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو لاینحل مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

۳۔ تیسری قسم کے مرکب تصورات، تعلق، علاقہ اور اضافت (Relations) کو ظاہر کرتے ہین،

سب سے زیادہ عام تعلق جو ہر شے پر حاوی ہے، علت و معلول کا تعلق ہے، اس کا تصور اسطرح ہوتا ہے، کہ ہم اشیا میں تغیر محسوس کرتے اور یہ مشاہدہ کرتے ہین، کہ ان کا وجود منحصر ہوتا ہے، کسی دوسری شے کے فعل پر، لاک علت (Cause) کے تصور کا زیادہ تجزیہ نہیں کرتا، اس کا تکملہ اس کے بعد ہیوم نے کیا جو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تصور بھی اسی قدر واہمہ کی تخلیق ہے، جسقدر کہ مادہ کا تصور،

تصورات کے مطالعہ کے بعد علم اور یقین کے مسائل کی طرف لاک متوجہ ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس نے لسانیات کے متعلق ایک طویل بحث کی ہے، جسے ہم نے مختصراً اوپر بیان کیا، اسی وجہ سے لاک فلسفہ کے بانیوں مین شمار کیا جاتا ہے،

تمام اشیا جو موجود ہیں، جزئی (Particular) ہین، لیکن الفاظ کی زیادہ تعداد عام تصورات کے متعلق ہے، یہ بات بے توجہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ ضرورت اور عقل کا تقاضا ہے، اب سوال یہ ہے کہ نوع (Species) اور جنس (Genus) کے کیا معنی ہیں، اور یہ کس طرح بنتے ہیں، ہمارے تصورات ابتداءً مخصوص ہوتے ہیں، بچوں کا تصور اپنے ماں اور باپ کے متعلق صرف انہی افراد کی تصویر ہوتا ہے، ان کیلئے جو نام وہ رکھتا ہے اس سے مراد صرف ان کی ذات ہوتی ہے لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، اور دنیا سے واقفیت ہوتی جاتی ہے، وہ دیکھتے ہین کہ دوسرے لوگ بھی ان کے ماں باپ سے مشابہ ہیں، اور ان میں جو مشترک خصوصیات ہیں، اُن کیلئے ایک خاص تصور ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، جس کا نام وہ آدمی رکھتے ہین، اور اس طرح وہ ایک کلی تصورات (General) کے لئے ایک عام نام رکھتے ہیں، جسمیں وہ کوئی ایجاد نہیں کرتے، بلکہ مختلف افراد کی خصوصیات

کو نظر انداز کر کے ان کے مشترک صفات کو لے لیتے ہیں، اسی طرح عام تصور حاصل ہوتے ہیں عمل تجرید و تعمیم ضروری چیز ہے، اسلئے کہ ہر شے کیلئے خاص نام رکھنا ناممکن ہے، ذہن انسانی کی قوت سے زیادہ ہے، کہ وہ ہر چیز کا جسے کہ وہ محسوس کرے، خاص نام رکھے، اور اسے حافظہ میں محفوظ رکھے، بفرض محال ایسا ہو بھی، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، اور نہ اس طرح علم کی ترقی ہو سکتی ہے، اگرچہ ہمارا علم مخصوص (PARTICULAR) مشاہدات پر منحصر ہے لیکن اسکی ترقی عام خیالات کی محتاج ہے، جو صرف اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں، کہ چیزوں کو نوع میں تقسیم کیا جائے، اور ان کیلئے عام اصطلاحات ہوں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عام تصورات ہمارے ذہن کی تخلیق ہیں، ان کا خارجی وجود نہیں، اس میں شک نہیں کہ فطرت نے بعض چیزوں کو یکساں بنایا ہے، جس میں خصوصًا جانوروں کی مختلف قسمیں ہیں، لیکن ان کو ایک نوع قرار دینا، ذہن انسانی کی ایجاد ہے، افلاطون کا یہ نظریہ کہ عام تصورات غیر مخلوق اور غیر تغیر پذیر جوہر ہیں، فطرتِ اشیار کے علم کی کمی پر مبنی ہے، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے، کہ تمام اشیار اپنے خالق کے سوا تغیر پذیر ہیں، آج جو چیز گھاس نظر آتی ہے، کل کسی جانور کا گوشت و پوست ہو جائے گی، اور چند دنوں کے بعد ایک آدمی کا جزو بدن، غیر جاندار اور جاندار عالم میں جنس نوع جوہر اور جوہری شکل SUBSTANTIAL FORM کو مابعد الطبیعیات والے فطرت کی تخلیق سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں، کہ ان کا اشیار میں وجود ہے، (ارسطو) یا اشیار سے الگ وجود ہے، (افلاطون) ان کا جب غائر مطالعہ کیا جاتا ہے، تو ان کی حقیقت صرف اس قدر نظر آتی ہے، کہ یہ ذہن کی ایجاد ہیں، جو صرف سہولت کے خیال سے بنائے گئے ہیں، تاکہ بعض مجموعۂ تصورات کے بیان کرنے میں صرف ایک لفظ کافی ہو،

اس ضمن میں یہ قابل غور ہے، کہ بعض الفاظ کے معنی میں کسقدر التباس ہوتا ہے، خصوصًا نوع یا جاندار ہستی کی تعریف کرنا کسقدر مشکل ہے، نوع حیوانی کے حدود اس قدر غیر متیقن ہیں، کہ آدمی کی کوئی تعریف بھی اب تک اسقدر جامع اور مانع نہیں کیگئی ہے، کہ ایک مفکر کے لئے تشفی بخش ہو، علمائے نباتیات، نوع کی بہتیری تقسیم کرتے ہیں، بخلاف اسکے بعض جگہ نوع کی تقسیم میں کمی کی جاتی ہو، ہر جگہ افراط و تفریط نظر آتی ہے، مثلاً بر شیرا

اور چیتا کیوں اسقدر صاف طور پر مختلف نوع نہیں، جتنے کہ کتا اور ہاتھی، ہر وہ شخص جو غور و فکر کا عادی ہے، اور ایک عام تصور کے ماتحت مختلف افراد کا مشاہدہ کرتا ہے، یقینی اس نتیجہ پر پہنچے گا، کہ ان میں کے بعض افراد اسی قدر متبائن اور مختلف ہیں جتنے کہ بعض وہ افراد جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں یہ قابل ذکر ہو کہ تغیر انواع (ansmuta-tion of species) کا نظریہ لاک کے اس خیال سے مستنبط ہے، کہ نوع کا وجود خارجی حقیقی نہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انتہائی اسمیت (Nominalism) انتہائی موجودیت (Realism) کے قریب پہنچ گئی ہے، لاک برابر یہی کہتا ہے کہ اپنے خالق کے علاوہ ہر چیز تغیر پذیر ہے، اسلئے نوع و جنس وغیرہ محض نام ہیں علمائے مابعد الطبیعیات کی یہ تاریخی غلطی ہے، کہ وہ الفاظ کو اشیار کی حقیقت سمجھتے ہیں، ہمیں اس پر قانع ہونا چاہیے، اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ علم کی ایک سرحد ہے، جسکے پرے ہم نہیں جا سکتے ہیں،

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کی حقیقت کیا ہے، لاک کے نزدیک یہ صرف تصورات کا تعلق ان کا باہمی اتفاق یا عدم واقفیت اور بے تعلقی کا احساس ہے، اس تعریف سے یہ مستنبط ہوتا ہے، کہ ہمارا علم ہمارے تصورات سے زیادہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ محدود ہے، اسلئے کہ ہمیں بہتیرے مفرد تصورات کے تعلق کا علم نہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ موجودہ علم میں بہت کچھ ترقی کی گنجایش ہے، تاہم یہ کبھی بھی اس حد تک نہیں پہنچ سکتا کہ ہم اپنے تمام تصورات کے تعلق کو اپنی خواہش کے مطابق معلوم کر لیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ان کے متعلق جو سوالات پیدا ہوں ان سب کو حل کر لیں، مثلاً ہمکو مادّہ اور نفس کا تصور ہے، لیکن غالبًا ہم کبھی بھی جان نہیں سکیں گے کہ ایک محض مادی شے میں شعور کی صلاحیت ہے، یا نہیں، چونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ قادر مطلق نے کسی خاص مادہ میں شعور کی صلاحیت دی ہے، یا نہیں ہمیں اپنی روح کے وجود کا پورا شعور ہے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے، اور جو شخص بھی آزادی رائے کے ساتھ روحانی یا مادّی نظریوں کی دشواریوں پر غور کریگا، تو وہ شاید ہی اس بات کا قطعی اور حکمی فیصلہ کر سکے، کہ روح مادہ نہیں، جس طرح کہ ہم مادہ اور احساس کے تعلق یا اختلاف سے بالکل ناواقف ہیں، اسی طرح ہمارے لئے یہ ناممکن ہے، کہ کسی شے کے ثانوی صفات کے مابین یا ثانوی صفات

اور اوّلی صفات کے اتحاد یا تنافر کے متعلق کچھ جان سکیں،

ہمارا علم تصورات کے پرے نہیں جاسکتا، صرف ان کے اتفاق یا عدم موافقت کا احساس ہو سکتا ہے، ہم یہ بھی نہیں جان سکتے ہیں، کہ جن چیزوں کے یہ تصورات ہیں، ان کی اصل حقیقت کیا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ ہمارا علم ایک مسلسل التباس اور وہم فریب ہے، ہمیں اپنے وجود کا بلا واسطہ وجدانی علم ہے، اگرچہ مابعد الطبیعیات کے نقطۂ نظر سے روح کی حقیقت سے ناواقف ہوں، ہمیں خدا کا تصریحی (DEMONSTRATIVE) علم ہے، اگرچہ ہمارا شعور اسکے صفات کی کثرت پر حاوی نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا علم اسی طرح حواس کے ذریعہ ہوتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ہم ان کو بلا واسطہ نہیں جانتے، اسلئے ہمارا علم اسی حد تک صحیح ہے، جہانتک کہ ہمارے تصورات اور حقیقت اشیار میں مناسبت ہے، لیکن ایسا نہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہیں جس کے ذریعہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ہمارے تصورات اشیار کے مطابق ہیں یا نہیں، یہ یقینی ہے کہ ہمارے مفرد تصورات خارجی حقیقت کے مطابق ہیں، ذہن بغیر حواس کی مدد کے انھیں بنا نہیں سکتا، اندھے رنگ اور روشنی کا تصور نہیں رکھتے، اسلئے یہ ظاہر ہے کہ تخیل کی تخلیق نہیں، بلکہ واقعی اور حقیقی نتیجہ ہیں خارجی اشیار کے جو ہم پر اپنا اثر کرتی ہیں، خارجی اشیار کی حقیقت کا اس سے بھی ثبوت ملتا ہے، کہ کسی شے کو محسوس کرنے اور پھر حافظہ میں اس کا تصور کرنے میں بہت فرق ہے، اور وہ لذت یا الم جو کسی احساس کے ساتھ ہوتا ہے، اس وقت نہیں پیدا ہوتا، جب کہ خارجی اشیا موجود نہ ہوں، اور صرف حافظہ میں اس کا شعور کیا جائے، مزید براں ہم ایک حس کا دوسرے حس کے نتائج سے مقابلہ کرتے ہیں، اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے، کہ محسوس اشیار کا خارجی وجود ہے، اگر کوئی شخص آگ کا مشاہدہ کرے اور یہ شک ہو کہ یہ محض وہم ہے، تو اپنے ہاتھ کے ذریعہ بھی اسکو جانچ سکتا ہے، اور اگر یہ واقعی وہم ہے، تو اس کو جلنے کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی، اسطرح مختلف حواس ایک دوسرے کی صداقت پر شہادت دیتے ہیں،

خلاصہ بدیہی تصورات کا وجود نہیں، بدیہی اصول و قوانین یا اولیات بھی نہیں ہو سکتے، علم کے ذرائع دو ہیں،

حواس خارجی اشیاء کیلئے اور وجدان داخلی کیفیات کیلئے، اسلئے علم کی سرحد خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی مشاہدہ اور تجربے سے باہر نہیں، فلسفہ کو جوہر اور حقیقت اشیار کے مسئلہ سے قطع نظر کرنا چاہئے، مشاہدہ، استقرار اور تجربہ کے سوا، اور کوئی طریقہ نہیں استعمال کرنا چاہئے، روح کا وجود ہے، لیکن ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اس کا وجود مادی ہے یا غیر مادی، بے تعلقی کی آزادی ناممکن ہے، خدا موجود ہے، لیکن اسکی حقیقت کا ہمیں علم نہیں، خارجی طور پر ٹھوس پن، مکانیت، شکل اور حرکت وغیرہ اولی صفات ہیں، ان کے علاوہ ثانوی صفات (رنگ، آواز، ذائقہ وغیرہ) بھی ہیں، جو صرف ہمارے ذہن کے احساسات ہیں جنھیں اوّلی صفات ہمارے ذہن میں پیدا کرتی ہیں، یہ بجائے خود اشیار میں موجود نہیں، جسم کا جوہر اور اسکی صفات کا مجموعہ ایک ہی چیز ہے، نوع کی حقیقت کچھ بھی نہیں،

خواجہ حسن دہلوی

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی،

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان کے فارسی گو شعراء میں صرف فیضی اور امیر خسرو کو یہ شرف حاصل ہے، کہ انکے شاعرانہ فضل وکمال کو ایرانی شعراء نے بھی تسلیم کیا ہے لیکن اس شہرت میں امیر خسرو کے معاصر خواجہ حسن دہلوی بھی اُن کے شریک وسہیم ہیں، اور ایرانی شعراء اور تذکرہ نویسوں نے جابجا دونوں کا نام ایک ساتھ لیا ہے، چنانچہ دولت شاہ سمرقندی ایک موقع پر لکھتے ہیں،:۔

فضلا متفق اند کہ سوزِ خسرو و لطافتِ حسن و نازکیہائے کمال وصفائے سخن حافظ در کلام امیر شاہی جمع است"

آصفی کہتے ہیں،:۔

زخوبان گفتہائے آصفی حالے دگر دارد   کہ اورا سوزِ خسرو نازکیہائے حسن دیدم

عبید زاکانی کہتا ہے،

گر غزلہائے جہاں روز و بہندستان قند   روح خسرو با حسن گوید کہ ایں ... گفتہ است

دولت شاہ نے حسن کی ایک غزل نقل کی ہے اور لکھا ہے، کہ فضلاء نے اس غزل کے بہت سے جواب لکھے، لیکن کوئی جواب اس غزل سے بہتر نہ ہو سکا، حسن کے فخر کیلئے یہ بات کیا کم ہے، کہ نہ صرف امیر خسرو بلکہ کمال اور حافظ کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے، اور ایرانی شعراء ان کی غزلوں کا جواب لکھتے ہیں، اور اُن سے جواب بن نہیں آتا،

یہ عجیب بات ہے کہ خواجہ حسن عام طور پر سعدیِ ہند کے لقب سے مشہور ہیں لیکن دولت شاہ نے لکھا ہے کہ وہ امیر خسرو کا تتبع کرتے ہیں لیکن بہر حال بات ایک ہی ہے خود امیر خسرو شیخ سعدی کے تتبع ہیں، اور حسن نے

امیر خسرو کا تتبع کر کے اس شراب کو اور دو آتشہ کر دیا ہے، دولت شاہ نے خواجہ حسن کے کلام پر ان الفاظ میں اجمالی ریویو کیا ہے،

سخن پر حال و سہل ممتنع دارد، اگرچہ پرصنعت نیست امانہایت بدل نزدیک و روان است"

اور ہم اسی اجمال کی تفصیل کرنا چاہتے ہیں،

غزل درحقیقت نام ہے، اُن عاشقانہ جذبات کا جو نہایت، نرم وشیریں الفاظ، اور پر درد لہجہ میں عجز ونیاز کے ساتھ ظاہر کئے جائیں، خسرو اور سعدی کا اصلی وصف یہی ہے، اور حسن نے اس وصف کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں،:۔

سر بگرداں کہ خاک پائے توام   عہد شکن کہ در وفائے توام

تا تو چوں آسماں شدی سرکش   من زمیں وار خاک پائے توام

تا تو سلطان آرز و بخشی،   من بصد آرز و گدائے توام

گر نہ رایت بود نیارم زیست   من کہ خود زندہ ام برائے توام

گر اجابت کنی دعائے کسے،   من شب و روز در دعائے توام

از درت دور نیستم چوں حسن   چہ تواں کرد مبتلائے توام

غمت را جائے جز در جاں نباشد   من از جاں فارغم گر آں نباشد

غمت ہر گہ کہ مے آید بیا گو،   درِ درویش را درباں نباشد

غریبے دوش می نالید و می گفت   شبِ عشاق را پایاں نباشد

حسن وصلِ تو مے جوید محال ست   گدا ہم کاسہ سلطاں نباشد

مرا ہمے بخرد ہیچ کس بہ بازارے   غلام را بترے نہ چہ عیب بر دلال

یک غلامست حسن نام درونے ناخوش   گر قبول از تو فتد گرد سرش گردانم

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہیچ بستان نشد اتفاق شاید کہ بایں بہا گرانم

عشق و محبت میں درد و غم اور سوز و گداز کے اظہار کا بہترین موقع اسوقت ملتا ہے، جب دو درد رسیدہ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی پر درد کہانی سنکر اپنی داستان غم سنانا چاہتا ہے، شیخ سعدی نے اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا تھا،

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

اور خواجہ حافظ نے اس خیال کو اور بھی بلند آہنگی کے ساتھ ظاہر کیا ہے،

بنال بلبل اگر با منت سر یاری است کہ ما دو عاشق زاریم کار من زاری است

لیکن خواجہ حسن نے اس لے کو بہت زیادہ بڑھایا ہے،

اے مرغ بنال تا بنالیم از آخر خویش درد بالیم

از دوستی ہوا تو نالی، ما ہم بہوائے دوست نالیم

تو بہر وصال گل زنی پر، ما زیر پر فراق بالیم،

میدان فراق را شدہ گوئے انگاہ مپرس در چہ حالیم،

تو یافتہ جمال محبوب ما گم شدگان آن جمالیم،

تو ساختہ ہزار دستان ما سوختگان تو زالیم

ما و حسن و نوا و نالہ، اے مرغ بنال تا بنالیم،

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس درد و غم اور عجز و نیاز کے ساتھ جوش بیان کو بھی پوری طور پر قائم رکھتے ہیں، اور الفاظ کی سادگی اور شیرینی میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے، مثلاً :-

بیا کہ بر ہمہ خوبان شہر شاہ توئی، چو غنچہ در صف گل صاحب کلاہ توئی

کلہ بپوش کہ فرمان ہر دیار تراست کمر بہ بند کہ سالار ہر سپاہ توئی

زہے نشاط دران سینہ کہ منزل تست زہے رواج دران کشورے کہ شاہ توئی

بروشنان فلک حاجتے ندارم ازانک مرا بروز و شب آفتاب و ماہ توئی

زدست تو بکجا نالم زمام حکم تراست ز تو بسوئے کہ گریزم گریزگاہ توئی

ہراس چیست چو امید مرحمت از تست گناہ چیست چو بخشندہ گناہ توئی

کدام قاضی حکم حسن تو اند کرد، کہ ہم میانجی و ہم خصم و ہم گواہ توئی،

یہ جوش بیان اسوقت اور بڑھ جاتا ہے، جب وہ رندی و سرمستی کے مضامین باندھتے ہیں، اور اسوقت وہ سعدی ہند کے بجائے حافظ شیراز معلوم ہوتے ہیں،

صبا جنبید و وقت آمد کہ بلبل از چمن پرسد بنفشہ یاسمن شنید سمن از یاسمن پرسد

بہار است و ہوائے خوش خوشا وقت کسا کا کنون یکے جوئے رواں جوید یکے راہ چمن پرسد

بیک جرعہ ز جام لب دو عالم زندہ کن ونگہ خضر را گوئے اینک آب حیواں انچنیں باید

من باز بادہ خوردم رسم گذشتہ نو شد تسبیح بیع کردم سجادہ ہم گرو شد

ساقی بیار مے کہ چون زر گشت کارہا گل ریخت گنج زر ہمہ مرغزارہا

آمد بہار نو بدہ آن بادۂ کہن، کز یک نسیم او شگفد نو بہارہا

وقت ہوا خوش است ہوا از مزاج صبا بنشاندہ اند از ہمہ جانب غبارہا

اون کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے، کہ غزل میں مدح لکھتے ہیں، چنانچہ اس غزل میں بھی سلطان علاء الدین کی مدح لکھی ہے،

شہ اتفاق جشن کند گوئیا کہ گل، از زر و سیم ساختہ اند ایں نثارہا،

با غنچہ داشت ہر سر و کارے کہ داشت گل بکشا سر قرابہ کہ بکشاد کارہا،

سلطاں علاء دنیی و دین آنکہ روزگار شاہے چو او نیافتہ در روزگارہا،

نامش محمد است، محمد صفت بہ ہیں،
دیں رازوال دولت او شد مدارہا،

چوں شرح بذل اوست بروں از حسابہا
سال بقاش باد فزوں از شمارہا

اور اس لحاظ سے گویا اوپر کے اشعار تشبیب بن گئے ہیں،

اس زور بیان نے اُن میں ایک وصف قادر الکلامی کا پیدا کر دیا ہے جس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، بعض اوقات مسلسل غزلیں لکھتے ہیں، اور اون میں ایک ہی قسم کے خیالات نہایت دلآویزی سے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً:۔

ایں منم کز تو سلامے بمن آورد رسول
تازہ تر کرد ہوائے من و امید وصول

نامہ آورد رسول تو و من از شادی
گہ سر نامہ ہمی بوسم و گہ پائے رسول

گر جوابے ز نویسم کرمت بسیار است
فضل کن ہر چہ ترا در نظر آید ز فضول

من خود از شوق تو پیچیدہ سرم چوں نامہ
تن نالاں چوں قلم از کشش عشق ملول

روئے خود ساختہ ام صفحہ بجائے کاغذ
عذر قرطاس بود نیز دکریماں مقبول

قلم از نوک مژہ کردہ سیاہی از چشم
ہمہ شب شرح غمت را بکتابت مشغول

گفتیم حال حسن چیست ز اقبال غمت
کار بر حسب مراد است غرضہا محصول

اسی سلسلے میں معشوق کے مسلسل اوصاف بھی داخل ہیں، مثلاً:۔

برد از من روانے، من روانے،
بتے، شوخے، لطیفے، دلستانے،

مئے، لبے، گلے، شنگے، عبیرے،
خوشے، خوبے، حبیبے، مہربانے،

حریفے، دلبرے، شنگے دلیرے
ظریفے، نازکے، تیرے، کمانے،

طبیبے، داروے، دردے، بلائے،
قضائے، محنتے، رنجے، فراقے،

کمندے، ناوکے، تیرے، خدنگے،
امیرے، بادشاہے، پہلوانے،

شریفے، شاہدے، خمرے، خمارے
لطیفے، سرکشے، جان جہانے،

حسن مداح او گشتی، ازاں شد
زبانت در سخن، گوہر فشانے،

اگر چہ ان اشعار میں کوئی کیف و اثر نہیں ہے، تاہم بہر حال ان سے اون کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے، بعض اوقات اپنی اور معشوق کی ایک ایک چیز کو لیکر ایک وصف خاص میں دونوں کا اشتراک ثابت کرتے ہیں جس سے کہیں تو معشوق کی خوش جمالی اور اپنی زبون حالی ثابت ہوتی ہے، اور کہیں دونوں میں مساوات کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً:۔

خال تو و حال من ہر دو سیہ ہمچو قیر
ذہن من و روے تو ہر دو چو ماہ منیر

قد من و ابروے ہمچو کمان کژ بود
قد تو و قول من، راست بود ہمچو تیر

فرق تو و جسم من ہر دو چو ماہ نو ست
موئے تو و روز من ہر دو چو شب گشت تیر

قہر تو و صبر من تلخ چو زہر آمدہ است
وصل تو و کام من ہیچ چو امید بیر

لطف تو و عشق من ہمچو فرح جان فزا،
حسن تو و شعر حسن ہر دو روان دلپذیر

بعض اوقات مکرر قافیے لاتے ہیں، اور ان کو نہایت خوبی کے ساتھ نباہتے ہیں۔ مثلاً

اے طبیب آخر ز من تاکے پرہیزی آہ آہ
دردمندان غمت را پرسشے کن گاہ گاہ

میکشم بار غم عشق تو بر دل کوہ کوہ
خرمن صبرم بباد نیستی شد کاہ کاہ

در ہوائے ابروے پیوستہ سرگردان ہلال
ہیشود باریک زیں غم می گریزد ماہ ماہ

پیل بند عشق تو بر عرصہ دل استوار
شاہ رخ بنما کہ مات است از غزاوشاہ شاہ

از سر مستی حسن چاہ زنخدانش گرفت
دست بگر فتش کہ اے دیوانہ ہستی چاہ چاہ

اونکے کلام کی ایک خصوصیت تشبیہ کی جدت اور لطافت ہی، وہ نہایت سادہ مگر بالکل جدید اور نیچرل تشبیہیں پیدا کرتے ہیں، جو نہایت نازک اور لطیف ہوتی ہیں، مثلاً

خالِ تو بر زنخ چہ تکیہ زند، طفل نزدیک چہ چرا خسید،

خطت برلب چو زنگی دایہ ہیں گرفتہ شیر خوارے را در آغوش

کنوں کہ ختم شدش بر بتان نبوت حسن ززلف تیرہ بر انگیخت لیلۃ المعراج

دوست حاضر ہمچو شاخ گل ولے از رقیبش تند بادے داشتم

یا رخ خوے کردہ بر بام آمدی، چون گل نو خاستہ باراں زدہ،

ز دستِ عشق چناں عاجزست عقلِ حسن کہ پیش شحنۂ جبار عاملِ معزول

ابر چوں چشمِ زلیخا بہر یوسف اشکبار ژالہا چوں دیدۂ یعقوب پیغمبر سفید

بید لرزاں از شمال اینک چو اصحاب الشمال یاسمیں مانند اصحاب الیمیں دفتر سفید

بعض الفاظ میں عربی فقرے نہایت خوبی کے ساتھ لاتے ہیں، جس سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً:-

سورۂ فاتحۂ روے ترا ہر کہ بدید، "قُل ہُوَ اللّٰہُ اَحَد" خواند و باخلاص دمید

"انبت اللہ نباتا حسنا" گفت و گذشت خضر آنگہ کہ بگردِ شکرت سبزہ بدید

"زادک اللہ جمالا" نتواں گفت کہ نیست بجمالِ طرب افزاے تو امکانِ مزید

خطِ تو برلبِ تو فسونیست پر شکر تا ذکر شہد "فیہ شفاء" نوشتہ اند

عفو است گر ز حشمت تبرے رسید مارا بے قصد بود دانم "رمیا بغیر رامی"

اون کے کلام کی ایک عام خصوصیت جو حضرت امیر خسرو کے تتبع کا فیض ہے، رعایتِ لفظی ہے، لیکن حضرت امیر خسرو نے اپنی بعض مثنویوں میں اسکو ضلع جگت کی حد تک پہنچا دیا ہے، لیکن امیر حسن اسکا

استعمال نہایت لطافت کے ساتھ کرتے ہیں،

سرکش چو نہ سپہری روشن چو ہفت کوکب در چاردہ نباشد ماہے بدیں تمامی،

با آنکہ دُر و علم بخشیدۂ تو خواہم زاں لعل آبدارت یک چند بوسہ وامی

چشم حسن سفید شد در رہِ انتظار تو بوکہ ز چوں تو یوسفے بوے وفا بوے رسد

رُوحے کہ یابد روحِ من از یک نسیم کوے او واللہ کہ نتواں یافتن از ہشت بستاں یا تقد

حسن اگرچہ تصوف کے ایک خاص سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں صوفیانہ حقائق و اسرار اور اخلاقی مضامین نہیں پائے جاتے، وہ خالص عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں، اور اس رنگ میں ان کے داخلی اشعار حد اعجاز تک پہنچ جاتے ہیں، مثلاً

اے سروِ تو بشادم شکلت بغلاں ماند، اے گل تو خوشنودم تو بوے کسے داری

گر غنچہ دہد بوے دانم کہ تو می خیزی، در صبح شود طالع دانم کہ تو می آئی،

گر بندہ خریدن را از خانہ بروں آئی، امروز مرا باشد ز اقبال تو بازارے

اے دو جہاں فداے تو تو ز جہان دیگری باغ و بہارِ حسن را سرو روان دیگری

بامداداں نامۂ دادت حسن گریہ کناں قصہ اش خواندی و در آبِ رواں انداختی

اے قاصد از کجائی از ہر کجا کہ آئی بنشیں کہ ہست در تو بوے آشنائی

از آستینت ما را پر مشک گشت دامن ایں نامہ میکشی تو یا نافہ مے کشائی،

دارم بشہر ماہی کز خرمنِ جمالش خورشید خوشہ چیند مانند روستائی

امروز وقت صبحم آمد از و سلامے،

خوش وقت صبحگاہاں آغازِ روشنائی،

اللہ اللہ ایں توئی یارب کہ مہمانِ منی دوش در دل بودہ امروز در جانِ منی

سر بسودائے تو در بازم کہ سر باز توام — جاں بزیر پایت افشانم کہ جانان منی،

خسرو پرویز گر شیرین و شکر ہر دو داشت — تو بدیں لبہائے شیرین شکرستان منی،

اے کہ عمرے تشنہ بودم شکرِ وصل ترا — قطرۂ در کارِ من کن کآب حیوان منی،

گر حسن صد بار میگوید کہ من زانِ توام،

کے چناں باشد کہ یک رہ گوئی آن منی

بود گہے کہ سر گیسوئے تو باز کنم، — برائے وصل تو از وے شبے دراز کنم

ہمہ حدیث بہشت است و آیت رحمت — بفال روے تو ہر مصحفے کہ باز کنم

بموضعے کہ مرا قبلہ مشتبہ گردد — بجانب کہ تو ئی آن طرف نماز کنم

مسافرے کہ برو گردت از درت نبود

اگر ز کعبہ رسیداست در فراز کنم

غرض ان تمام خصوصیات کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ انکا کلام سعدی، حافظ، اور امیر خسرو کے کلام کا مجموعہ بلکہ ان سب کا عطر مرکب ہے، اور وہ امیر خسرو کے متبع ہونے کے ساتھ جیسا کہ جامی کا خیال ہے، ایک طرز خاص کے موجد بھی ہیں،

مقالاتِ شبلی جلد چہارم

(تنقیدی)

مطبوعہ اور قلمی کتابوں پر مولانا شبلی مرحوم کے جو تبصرے الندوہ اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے تھے اسمیں یکجا کئے گئے ہیں، مصر کے مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان کی تصنیف تمدنِ اسلامی پر عربی میں جو ریویو ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا تھا، اس کا اردو خلاصہ بھی مولانائے مرحوم کے قلم سے الندوہ میں شائع ہوا تھا، وہ اہم تنقیدی مضمون بھی اس میں آگیا ہے، ضخامت ۱۹۰ صفحے، قیمت :- ۱۲؍

مونس الاحرار فی دقائق الاشعار

از

نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمان خان شیروانی

یہ متقدمین شعرائے فارسی کے کلام کی ایک بیاض میرے کتاب خانہ میں ہے، [illegible] میں تالیف ہوئی، جامع بیاض کا نام احمد بن محمد بن احمد بن محمد معروف بہ کلاتی اصفہانی ہے، محلہ دردشت کے رہنے والے تھے، کلاتی کے ذکر سے معجم البلدان اور انساب سمعانی دونوں ساکت ہیں، کشف الظنون میں مونس الاحرار کا نام نہیں، تذکرے بھی کلاتی کے حال سے خالی معلوم ہوتے ہیں،

دیباچہ میں جامع بیاض نے لکھا ہے کہ میں اصفہان کے علما و فضلاء کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، اُن کی صحبت میں امام رشید الدین محمد المعروف بہ رشید وطواط کی کتاب حدائق السحر کا تذکرہ رہتا، شعرائے ماضی کے کلام کا مذکور ہوتا، میں نے اُن کے اس شوق کو دیکھ کر اور ایما پاکر مشاہیر شعرا کے کلام سے یہ انتخاب تیار کیا،

موضوعِ انتخاب یہ ہے کہ جن لطائف اور صنائع و بدائع کا بیان حدائق السحر میں ہے اور جن کی مثال میں رشید نے ایک ایک شعر نقل کیا ہے، میں نے ان کے متعلق ایک ایک باب مرتب کر دیا ہے، انتہی خلاصتہ، چنانچہ تیس باب پر یہ بیاض مشتمل ہے، ترتیب ملاحظہ ہو،

باب اول توحید، دوم نعت، سوم حکمت و موعظت، چہارم قسمیات، پنجم تسمیطات علی ہذا القیاس،

خوبی خاص اس بیاض کی یہ ہے کہ ہر باب میں پورے پورے قصیدے اساتذہ کے وافر مقدار میں نقل کئے ہیں، اور تمام مشہور اساتذہ کا کلام انتخاب میں لایا گیا ہے، جملہ ۴۷ اشعرا کا کلام ہے، کتاب کے صفحات کا شمار ۴۰۲ ہے، مثلاً طبقۂ اول کے حسب ذیل شعراء کا کلام ہے،

غضائری، اسدی طوسی، ابو الفرج رونی، عنصری، عسجدی، مسعود سعد سلمان، ناصر خسرو، عمعق بخاری،

قطران، فرخاری، امیر معزی، ابو الفتح بستی، ابو المعالی رازی، ازرقی، خواجہ سنائی،

ان مین سے ابو الفرج رونی کے قلمی قصائد اور خواجہ سنائی کا کلیات میرے یہان ہے، دوسرے طبقات

مین سے شمس الدین طبسی، سوزنی، وغیرہما کے دیوان ہین،

طبقۂ بالا کے شعرا مین وفات کے لحاظ سے سب سے متقدم اسدی طوسی ہے، المتوفی ۴۲۵ھ۔ اس کے بعد

غضائری ہے، المتوفی ۴۲۶ھ،

چوتھی صدی سے لیکر چھٹی صدی تک کے شعرا کا تین سو برس کا کلام اس بیاض مین ہے، رودکی کا کلام

نہین ہے، معلوم ہوتا ہے اُس وقت بھی نایاب تھا،

جب اس پر لحاظ کیا جائے کہ جن شعرا کا کلام اس مجموعے مین ہے، اُن مین سے بہت سے ایسے ہین

جنکا کلام یا بالکل نایاب ہے یا مفقود ہو چکا ہے تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، آخر کا باب (بتیسوان)

اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس مین "لغت فرس، عروض اور رباعیات" ہین،

نسخہ جدید الخط ہے مگر بالکل جدید نہین، خط صاف پختہ ہے، جہان نگاہ ڈالی گئی اغلاط سے پاک معلوم ہوا،

ایسا قیاس ہوتا ہے کہ کسی سخن شناس نے اپنے شوق سے نقل کی ہے، آخر مین نام کاتب یا سنہ کتابت نہین ہے،

اس کی بھی تصریح نہین ہے کہ کتاب ختم ہوئی، دفعتہً قلم رکھدیا ہے، ممکن ہے کہ نسخہ ناقص ہو، بہر حال آخر کے باب

کا حصۂ وافر موجود ہے،

(باقی)

معارف:۔ مونس الاحرار فی دقائق الاشعار کے نام سے اسی قسم کی ایک بیاض یا مجموعہ اس کے بعد

محمد ابن بدر شاعر نے ۷۴۱ھ مین لکھا ہے، سر ڈینی راس نے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے جرنل مین اسکا حال یہ لکھا تھا،

اس قلمی نسخہ کا نام مونس الاحرار (فی دقائق الاشعار) ہے، ہ پانچ سو صفحون کی کتاب ہے، تالیف کا سال

۷۴۱ھ ہے، اس مین قدیم شعرار سے لیکر مصنف کے وقت تک کے نامی شعراء کے کلام کے انتخابات

موجود ہین، مصنف کا نام محمد بن بدر جاجرمی ہے "

مصنف کا نام اور سال تصنیف اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے، جو اس کتاب کے دیباچہ مین ہے،

در ہفصد و چل بود و یک اندر رمضان ۷۴۱ھ | مہر اندر حوت و ماہ اندر سرطان
بر دست محمد بن بدر شاعر | مجموعہ تمام شد بفضل یزدان

کتبخانہ حبیب گنج کے اس نسخہ کا نام اور موضوع گو یہی ہے، مگر اس کا مصنف اور ہے، اور زمانہ اس سے

۳۹ برس پیشتر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلاتی اصفہانی کا یہ مجموعہ اس خیال کا نقش اول اور محمد بن بدر کا

مجموعہ نقش ثانی ہے،

قانونِ شیخ کا پہلا مطبوعہ نسخہ،

از

مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رامپور،

شاہی کتاب خانہ رامپور میں قانون شیخ الرئیس (ابو علی سینا) کا ایک نسخہ محفوظ ہو، یہ نسخہ کتاب اول ثانی اور ثالث پر مشتمل ہو، اور حسب تحریر کاتب ۱۸ ۱۱۱۱۱؁ھ میں لکھا گیا ہے،

کاتب نے کتاب ثانی کے خاتمہ میں جو عبارت لکھی ہے، وہ قابل غور ہے، وہ لکھتا ہے:-

قد نسخ الکتاب الثانی علی الکتاب الذی ہو مضروبُ سکۃ. لا مکتوب بقلم وقد کتب فیہ ھٰذہ العبارۃ نسخ الکتاب الثانی من نسخۃ کانت بخط سید الامام ابن الحسن الحسینی. وھو ذکر فی آخر کتابہ انہ نقل من تعلیق الشیخ الرئیس ابن علی بن سینا،

اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہوتی ہین،

۱- اول یہ کہ نسخہ رامپور کا منقول عنہ مصنف کے نسخہ کی نقل در نقل تھا،

۲- دوم یہ کہ نسخہ رامپور کا منقول عنہ قلم کا لکھا ہوا نہ تھا، مضروب سکۃ تھا، سکۃ محاورہ عرب مین وہ منقوش لوہا کہلاتا ہے جس سے روپے ڈھالے جائیں، صاحب اقرب الموارد نے سکہ کی حسب ذیل تفسیر کی ہے:-

"السکۃ حدیدۃ منقوشۃ یضرب علیہا الدراھم. یقال "یضرب الدرھم فی سکۃ فلان" (اقرب، ج ۱، ص ۵۲۰)

ہمارے محاورہ میں سکہ کو ڈائی کہتے ہیں، ڈائی عموماً چھوٹی ہوتی ہے، اسلئے بڑے نقوش والے لوہے کو ٹھپّہ کہہ سکتے ہیں، بہر نوع مضروب سکہ کا مفہوم یہ قرار پاتا ہے، کہ منقوش لوہے کے ذریعہ تیار کیا گیا تھا، چونکہ اس طریق کار کا نام طباعت ہو، لہذا بجائے مضروب سکہ کے مطبوع کہنا خلافِ محاورہ نہ ہوگا،

اب دونوں صفتوں کے یکجائی معنی یہ ہوں گے، کہ نسخہ رامپور کا منقول عنہ قلمی نہ تھا مطبوعہ تھا، اور چونکہ اس زمانہ مین مطبوعہ کتاب کم یاب تھی، اسلئے کاتب نے خصوصیت سے منقول عنہ کی اس صفت کا ذکر کیا،

وہ نسخہ کب طبع ہوا، کہان طبع ہوا، اور کس نے طبع کیا، ان تمام سوالات کے قبل یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں پریس اس حد تک ترقی کر چکا تھا، کہ عربی کتابیں طبع ہوں، اگر اس کا جواب اثباتی ہے، تو یقیناً مقامِ طباعت اسپین یا فرانس وغیرہ یورپی ممالک ہونے چاہئیں، جہان قانونِ شیخ درس میں داخل تھا،

مجھے امید ہے کہ اصحاب علم بذریعہ معارف یا تحریر شخصی، اس امر کے متعلق، کہ آیا عبارت کا مرقوم مفہوم درست ہے یا نہیں، مجھے معلومات مہیا فرما کر ممنون کریں گے،

معارف:- عربی زبان کی کتابون کی طبع کا آغاز یورپ میں سولہویں صدی مین ہو چکا تھا، ۱۵۱۶؁ء میں عربی زبور چھاپی گئی تھی، (دیکھو الآداب العربیہ فی القرن التاسع عشر للاب لویس شیخو، جلد اول ص ۸، بیروت) قانون شیخ بزبان عربی سب سے پہلے رومہ (اٹلی) میں ۱۵۹۳؁ء میں تین جلدوں میں طبع ہوئی تھی پہلی جلد ۵۱۰، دوسری ۲۷۶، اور تیسری ۵۹۰ صفحوں میں اور اس کے آخر میں شیخ کی ایک فلسفیانہ کتاب نجات ضمیمہ کے طور پر تھی، (معجم المطبوعات العربیہ یوسف الیاس سرکیس (جلد اول ص ۱۳۰)

تلخیص و تبصرے

مکان و زمان کی سیر

برطانیہ کے نہایت ممتاز سائنس دان سر جمیس جانس (SIR JAMES JEANS) نے حال مین کائنات کے متعلق تقریرون کا ایک نیا سلسلہ ریڈیو کے ذریعہ شروع کیا ہے جس کی پہلی قسط کے اقتباسات رسالہ "لسنر" (LISTENER) کے حوالہ سے سنڈے اسٹیٹسمین (۴ر نومبر ۱۹۳۴ء) مین شائع ہوئے ہین، موصوف نے اس تقریر مین اپنے سامعین کو خیالی طور پر عالم کائنات کی سیر کرائی ہے، اور مکان و زمان کی وسعت سے انھین آشنا کیا ہے، ناظرینِ معارف کے لئے اسکا ملخص ترجمہ ذیل مین پیش کیا جاتا ہے۔

ستارون اور حقیقۃً اُن تمام اشیاء سے متعلق جو ہمارے کرۂ زمین سے باہر واقع ہین، تقریبًا ہماری تمام واقفیت اُس اشعاع (RADIATION) سے حاصل ہوتی ہے جو ان اشیاء کی طرف سے ہم تک پہنچتا ہے، اشعاع موجون کی شکل مین سفر کرتا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے ریڈیو کی موجون سے مشابہ ہین، دونون مین خاص فرق یہ ہے کہ ریڈیو کی موج اشعاع حرارت کی موج سے کرورڈون گنا اور اشعاع نور کی موج سے تقریبًا ایک ارب گنا زیادہ بڑی ہے، تاہم باوجود اس کے کہ شعاع اور ریڈیو کی موجون کی لمبان مین اتنا زبردست فرق ہے، دونون قسم کی موجین بالکل ایک ہی رفتار سے سفر کرتی ہین، یعنی (۱۸۶۰۰۰) میل فی سکنڈ،

ریڈیو کی موجین اس رفتار سے سفر کرتی ہوئی اکثر سطح زمین کے قریب پہنچکر رک جاتی ہین اور کرۂ ارض کے گرد ایک سکنڈ کے تقریبًا ساتوین حصہ مین چکر کر لیتی ہین، لیکن ان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا فضا مین نکل جاتا ہے، اور اسی

رفتار سے سفر کرتا ہوا زمین سے زیادہ دور ہوتا جاتا ہے،

ایک لمحہ کے لئے فرض کیجئے کہ ہم ان لاسلکی موجون مین سے ایک موج کے ساتھ سفر کر رہے ہین اور ہماری رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہے، پانچ سکنڈ کے بعد ہم چاند کے فاصلہ سے چوگنا فاصلہ طے کر لین گے اور ہماری زمین آسمان سے تقریبًا اتنی ہی بڑی دکھائی دینے لگے گی جتنا بڑا چاند ہمین اس وقت دکھائی دیتا ہے، ہم دیکھین گے کہ اس کی شکل گول ہے اور ظاہری صورت مین چاند کی طرح معلوم ہوتی ہے، پانچ منٹ کے سفر کے بعد زمین ہمین اتنی ہی بڑی نظر آئے گی جتنے بڑے سیارے اس وقت نظر آتے ہین، اس وقت ہم دیکھین گے کہ زہرہ، مریخ، مشتری اور دوسرے سیارون کی طرح یہ بھی محض ایک معمولی سیارہ ہے، پانچ سال کے سفر کے بعد خود آفتاب بھی صرف ایک چھوٹا سا ستارہ معلوم ہونے لگیگا، لیکن روشنی کی رفتار سے پانچ سال تک سفر کرنے کے بعد بھی ہم اپنے سفر کی محض ابتدائی منزلون مین ہونگے، ہم اسوقت بھی اپنے کو قریب ترین ستارون ہی کے درمیان پائین گے، لاکھون برس تک اسی رفتار سے چلنے کے بعد بھی ہمارے سفر کی راہ ستارون ہی سے روشن ہوگی جو ہمارے آفتاب سے کم و بیش مشابہ ہین،

سطور بالا سے ہمین اپنے مجوزہ سفر کے پیمانہ کا کچھ اندازہ ہو جائیگا، اس پیمانہ کو میل کے حساب سے بیان نہین کر سکتے، اس کے لئے ہیئت دانون کے نوری سال (LIGHTYEAR) کا حساب بہتر ہوگا، یعنی وہ فاصلہ جو روشنی ایک سال مین طے کرتی ہے، ایک نوری سکنڈ تقریبًا (۱۸۶۰۰۰) میل کے برابر ہے، اور ایک نوری سال تقریبًا چھ ملین (۶۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) میل کے، چاند کا فاصلہ $1\frac{1}{4}$ نوری سکنڈ ہے، جو سیارے قریب ہین اُن کا فاصلہ چند نوری منٹ اور جو دور ہین ان کا چند نوری گھنٹے ہے، لیکن قریب ترین ستارون کا فاصلہ بھی چند نوری سال کے برابر ہے، اور جو ستارے دور ہین ان کا فاصلہ سینکڑون ہزارون نوری سال کے برابر ہے،

اگر اس زبردست فاصلہ کو طے کرنے کے بعد بھی ہم اپنے سفر کو جاری رکھین تو کچھ عرصہ کے بعد ہم دیکھین گے کہ ہمارا راستہ اب کم روشن ہے اور ستارے فضا مین زیادہ دور دور بکھرے ہوئے ہین، بالآخر ہم اس خطہ مین پہنچتے ہین جہان

ستارے بالکل نہین ہین، اب ہم فضار کی تاریکی مین پہنچ گئے ہین، وہان سے ہمین ان ستارون کا جن کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم آئے ہین ایک جھرمٹ دکھائی دیتا ہے اور پھر زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ تمام فضاء ایسے جھرمٹون سے پُر نظر آتی ہے، انفرادی ستارون کی روشنی ہمین نظر نہین آسکتی لیکن لاکھون ستارون کے مجموعہ سے ایک طرح کی دھیمی اور مسلسل روشنی پیدا ہوتی ہے، ہم اس دھندلی روشنی کو سحابیہ کہتے ہین، ستارون کا وہ مجموعہ جو سب سے دور واقع ہے اور جسے ہم زمین سے دیکھ سکتے ہین اسکا فاصلہ کرۂ ارض سے ایک سو ملین (۱۰۰۰۰۰۰۰۰) نوری سال سے زیادہ ہے، ہم اسے اس روشنی کی مدد سے دیکھتے ہین جو دس کرور برس پہلے ہماری طرف روانہ ہوئی تھی، یعنی نسل انسانی کے روئے زمین پر ظاہر ہونے سے بہت پہلے، اسوقت زمین بڑے بڑے حشرات الارض کے قبضہ مین تھی، اس وقت سے برابر یہ روشنی ایک کروڑ دس لاکھ میل فی منٹ کی مستقل رفتار سے فضار مین سفر کرتی ہوئی آرہی ہے اور ابھی ہم تک پہنچی ہے، ہم نہین کہہ سکتے کہ اس طویل مدت مین اُن ستارون پر کیا گذری جن کی روشنی ہم اسوقت دیکھ رہے ہین؛ اسے معلوم کرنے کا اور کوئی طریقہ نہین بجز اس کے کہ ہم ایک سو ملین سال سے زیادہ انتظار کرین،

اس کے بعد ہم فضا کی بعید تر گہرائیون مین جائینگے اور ایسے خطون کے درمیان سے گذرینگے جن سے ریاضی دان کا تخیل تو آشنا ہے لیکن ہیئت دان کی آنکھون نے ان کو آج تک نہین دیکھا، اب ہم اپنے سفر کے اختتام تک پہنچ رہے ہین، اور پھر اپنے گھر واپس آجانا چاہتے ہین، لیکن ہم دیکھتے ہین کہ اپنے گھر پہنچنے کی سب سے قریب راہ یہ ہے کہ اس سفر کو برابر جاری رکھین، یہانتک کہ ہم پھر واپس اپنی زمین پر پہنچ جائین، وجہ یہ ہے کہ فضا بھی ہمارے کرۂ ارض کی طرح خود اپنی ہی جانب خم ہوتی ہے، اس لئے اگر ہم بخط مستقیم سفر کرتے چلے جائین تو بالآخر اسی نقطہ پر پہنچ جائینگے جہان سے روانہ ہوئے تھے، لیکن ہمین صحیح طور پر نہین معلوم کہ اس مین کتنی مدت صرف ہوگی، بعض ہیئت دانون کا خیال ہے کہ ہمین تقریباً بارہ ہزار ملین سال تک روشنی کی رفتار سے سفر کرنا پڑیگا، بعض کہتے ہین کہ اس سے بھی زیادہ مدت تک، اور بعض ہیئت دانون کی رائے ہے کہ جب تک ہم روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتاری

سے سفر نہ کرین ہم کبھی واپس پہنچ ہی نہین سکتے،

جو سفر ہمارے سامنے ہے اُس کی نوعیت یہ ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سفر پر روانہ ہون ہمین چاہئے کہ اچھی طرح اپنی زمین کو دیکھ بھال لین، کیونکہ فضا کی تمام چیزون مین یہی ایک چیز ایسی ہے جس کی تحقیق واکتشاف ہم پوری طرح کر سکتے ہین، اور یہ بھی کوئی آسان کام نہین ہے، روشنی کی شعاعین ہر وقت زمین تک پہنچتی اور ہم تک ستارون کے پیغامات پہنچاتی رہتی ہین، لیکن ایسی شعاعین جو زمین کے اندرونی حصہ کے پیغامات لائین موجود نہین ہین، کیونکہ زمین غیر شفاف ہے، یہ ایک تعجب خیز لیکن سچا واقعہ ہے، کہ چند سال پیشتر تک ہم ستارون کی ساخت و ترکیب کی نسبت جو کرورون میل کی دوری پر واقع ہین زیادہ واقفیت رکھتے تھے، بہ مقابلہ زمین کے اُس حصہ کی ساخت و ترکیب کے جو ہمارے قدم کے چند میل نیچے واقع ہے،

بہرحال ایسی موجین بھی ہین جو اگرچہ روشنی کی موجین نہین ہین، تاہم زمین کے اندرونی حصہ سے متعلق ہمین اطلاعات پہنچاتی رہتی ہین، یعنی وہ موجین جو زلزلون اور زمین کی تھرتھراہٹ کے وقت آزاد ہوجاتی ہین، بادی النظر مین زمین ایک بالکل ٹھوس اور سخت چیز معلوم ہوتی ہے، غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا اکثر حصہ سخت ترین فولاد سے بھی زیادہ سخت اور ٹھوس ہے، لیکن باوجود اس کے یہ ہمیشہ اینٹھتی اور کھینچتی رہتی ہے، کیونکہ اس کے اندرونی حصہ کے زبردست دباؤ کی وجہ سے اس پر برابر زور پڑتا رہتا ہے، بعض اوقات اس پر اتنا زور پڑتا ہے کہ اس کا مادہ کھینچکر ٹوٹ جاتا ہے، جیسے لوہے کی سلاخ یا کوئی لچک دار چیز زیادہ کھینچنے سے ٹوٹ جاتی ہے، اس ٹوٹنے سے جو دھاکا ہوتا ہے، اس سے زمین کے اندرونی حصہ مین وہ ارتعاش اور موجین پیدا ہوتی ہین جنکو ہم زلزلہ کے نام سے موسوم کرتے ہین،

موجین دو قسم کی ہوتی ہین، زلزلہ کی موجین انہی مین سے کسی ایک قسم کی ہوتی ہین، کچھ موجین ایسی ہوتی ہین جن کی حرکت ایک جانب سے دوسری جانب ہوتی ہے، اور کچھ ایسی ہوتی ہین جنکی حرکت آگے پیچھے ہوتی ہے، آگے پیچھے حرکت کرنے والی موجین ہر قسم کے مادہ کے اندر سے گذر سکتی ہین، خواہ وہ مادہ ٹھوس ہو، رقیق ہو

یا گیس کی شکل مین ہو، لیکن جو موجین ایک جانب سے دوسری جانب حرکت کرتی ہین وہ صرف ٹھوس مادہ مین سے گذر سکتی ہین،

زلزلہ کے وقت دیکھا جاتا ہے کہ دونون قسم کی موجین اندرون زمین کے بڑے حصہ سے گذرتی ہین، اور جب وہ سطح زمین پر نکلتی ہین تو اپنے ساتھ زمین کے اندرونی حصہ کی ساخت اور حالت کے متعلق وافر معلومات لاتی ہین، صرف اسی واقعہ سے کہ ایک جانب سے دوسری جانب حرکت کرنے والی موجین اندرون زمین کے اکثر حصہ سے گذرتی ہین یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حصہ ٹھوس مواد سے پُر ہے، لیکن اس کے علاوہ ایک مرکزی خطہ بھی ہے، جس کے اندر ان موجون کا گذر نہین ہو سکتا، اس خطہ سے صرف وہی موجین گذر سکتی ہین جو آگے پیچھے حرکت کرتی ہین، اس طرح ہمین معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے مرکزی خطے ٹھوس نہین ہین، واقعہ یہ ہے کہ زمین کے مرکز مین ایک وزنی رقیق مادہ پایا جاتا ہے، جس کے چارون طرف ٹھوس مادہ کا خول ہے،

لیکن یہ ٹھوس خارجی خول بھی بالکل سخت نہین ہے، ہم دیکھ چکے ہین کہ یہ خول اندرون زمین کے دباؤ کا اثر برابر قبول کرتا جاتا ہے، اس پر سطح زمین کے دباؤ کا اثر بھی پڑتا رہتا ہے، سائبیریا اور شمالی ایشیا کے برفستانی خطون کے پگھلنے کا اثر بھی نمایان طور پر زمین کی ساخت پر پڑتا ہے، اسی طرح پہاڑون کے وزن کا اثر بھی پڑتا ہے، ابتک ہم پہاڑون کو محض سطح زمین کی ناہمواری سمجھتے تھے، لیکن اب ہمارا خیال یہ ہے کہ پہاڑ زمین کی پپڑی کے چند ٹکڑے ہین جو اپنے مادہ کی نوعیت مین بقیہ ٹکڑون سے زیادہ ہلکے ہین اور اس لئے زمین کے کسی اندرونی طبق پر اسی طرح تیرتے ہین جس طرح کارک پانی پر تیرتا ہے، یہ اندرونی طبق اتنا کافی سخت ہے کہ اس مین سے زلزلہ کی دونون قسم کی موجین گذر جاتی ہین، تاہم اتنا نرم و ملائم بھی ہے کہ پہاڑون کے وزن سے دب جاتا ہے، پہاڑ اس طبق پر اسی طرح تیرتے ہین جس طرح جہاز سمندر مین، پہاڑون کا وزن بارش اور تیز دھارون کی وجہ سے جو اُن کے مادہ کو بہا کر سمندر مین لیجاتے ہین کم ہوتا جاتا ہے اور وزن کی کمی کیساتھ اُن کی سطح بھی زیادہ بلند ہوتی جاتی ہے، جس طرح کسی جہاز کا زیرین حصہ وزن کم ہو جانے کے بعد کچھ اوپر آجاتا ہے،

ان تمام باتون سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کوئی سخت اور ٹھوس چیز نہین ہے، بلکہ ایک نرم اور ملایم شے ہے، جو ہمیشہ بدلتی اور اثر قبول کرتی رہتی ہے، اور ضرور اس کی تاریخ کا ایک قدیم تر عہد بھی رہا ہوگا جب یہ اس وقت سے بھی زیادہ اثر پذیر تھی، کیونکہ ہمین زلزلہ کی موجون سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مادے زمین کے مرکز کے قریب ہین وہ اُن مادون سے زیادہ وزنی ہین جو اس کی سطح کے قریب ہین، اس کے مرکز کا اکثر حصہ غالباً لوہے سے مرکب ہے اور اس کی سطح چند ہلکے مادون سے بنی ہے، مثلاً آکسیجن، سیلیکون، اور الیومنیم،

یہ صورت حال محض اتفاقی نہین ہو سکتی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو مادے زیادہ وزنی تھے وہ تہ مین ڈوب گئے تھے، اور جو زیادہ ہلکے تھے ابھر آئے تھے، زمین کے اندر کے موجودہ حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک قدیم تر دور سے بھی گذر چکی ہے، جب کہ مادے اُبھرتے اور تہ نشین ہوتے تھے، یہ بات تقریباً مسلم ہے کہ زمین شروع مین گیس کا ایک گرم کرہ تھی جو ابتداءً آفتاب سے علحدہ کر لیا گیا تھا، رفتہ رفتہ گیس کا یہ گرم کرہ ٹھنڈا ہوتا گیا اور ٹھنڈا ہوتے وقت پہلے رقیق ہوا اور پھر ٹھوس ہو گیا، جو پرت سب سے اوپر تھے وہ قدرۃً سب سے پہلے سرد ہوئے، لہذا تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ایک سرد ٹھوس پرت زمین کے اوپر بننا شروع ہوئی تھی، اور زمین کے اندر کا تیز گرم مادہ اُس وقت تک رقیق اور شاید کسی حد تک گیس کی شکل مین تھا، اس کے بعد اندر کا حصہ سرد ہونے لگا ہوگا، اور سرد ہونے کی حالت مین پہلے سکڑا ہوگا اور پھر اس نے باہر کی ٹھوس پرت کو چھوڑ دیا ہوگا، یہ حصہ اندر کی رقیق پرتون پر بیٹھ گیا ہوگا، اور ایسی حالت مین بالائی سطح پر شکنین پڑ گئی ہونگی، ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ پہاڑی سلسلون کی تعمیر یون ہی ہوئی ہے، وہ زمین کی پرت مین گویا تہین اور شکنین ہین،

زمین کی عمر کا اندازہ اس مثال سے ہو سکیگا، زمین کی عمر کو پانچ سو صفحون کی ایک کتاب فرض کیجئے، اس کتاب کا ہر نقطہ کم سے کم دس ہزار سال کے برابر ہوگا، نسل انسانی اس کتاب کے سب سے آخر صفحہ پر بہت نیچے دکھائی دیگی، تمام انسانی تہذیب اس کے آخری نقطہ مین محدود نظر آئیگی اور تمام عہد عیسوی اس کے آخری حرف مین، اور ایک انسان کی پوری زندگی آخری نقطہ اختتام سے بھی کم مین،

کرۂ ارض کی تاریخ بھی ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے، ہم دیکھتے ہین کہ زندگی کے اوّل اوّل نمودار ہونے سے کرورون برس پہلے سے زمین ٹھنڈی ہو رہی ہے اور اس مدت سے بھی کرورون برس پیشتر سے موجود ہے، اس کے بعد ہم زندگی کو اس کی بالکل سادہ اور ابتدائی شکلون مین پاتے ہین، سب سے پہلے یہ صرف پانی تک محدود نظر آتی ہے، تقریباً چار سو ملین برس پہلے جمادات دکھائی دیتے ہین، پھر رفتہ رفتہ نباتات سطح زمین پر پھیلنا شروع ہوتے ہین اور ان کے بعد حیوانات نمودار ہوتے ہین جو پہلے نباتات سے اپنی غذا حاصل کرتے ہین اور پھر خود ایک دوسرے کو کھانے لگتے ہین، تقریباً دس کرور برس ہوئے زمین پر بڑے بڑے حشرات الارض کا قبضہ تھا، ان مین سے بعض نوّے فٹ لمبے اور چالیس پچاس ٹن وزنی تھے، لیکن اپنی جسامت کے باوجود وہ تنازع للبقاء کی کشمکش مین بالآخر ناکام رہے، اور انسان نے اُن کی جگہ اپنا تسلط قائم کرلیا،

زندگی کے حالات مین پچھلے پچاس سالون کے اندر جو تبدیلیان واقع ہوئی ہین وہ ان تبدیلیون سے کہین زیادہ ہین جو زمین کی ابتدائی زندگی کے پچاس ملین سالون مین پیش آئی تھین، اگر پچاس برس کی مدت مین یہ حالات اس درجہ بدل گئے ہین، تو آیندہ پچاس ملین سال کی مدت مین اُن مین کتنا تغیر واقع ہو جائیگا؟ کیا نسلِ انسانی کسی ایسی حیرت انگیز شکل مین تبدیل ہو جائے گی کہ ہم اس وقت اسکا تخیل بھی نہین کر سکتے، یا پھر روئے زمین سے بالکل غائب ہی ہو جائے گی، مثل اُن عجیب و غریب جانورون کے جو پچاس ملین برس پہلے اس پر قابض تھے؟

"ع ز"

موصل اور یہان کا فرقۂ یزیدیہ

شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی دار العلوم ندوۃ العلماء مین عربی علم ادب کے استاذ تھے، اب عراق مین بسلسلۂ درس و تدریس مقیم ہین، انھون نے عراق کے مشہور شہر موصل کی سیر کی ہے، اور وہان کی مذہبی علمی اور اخلاقی حالت پر اخبار الفتح مین ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، جس کی تلخیص حسب ذیل ہے،

موصل نہایت قدیم شہر ہے، حضرت یونس علیہ السلام نے یہین اپنا فرض رسالت ادا کیا تھا، اسوقت

نینوی کے آس پاس کی آبادی کو ملاکر وہان کے باشندون کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی، لیکن اسوقت صرف شہر کی آبادی قریب قریب اسی قدر ہے، اس کے علاوہ اس کے آس پاس بہت سے دیہات ہین، جہان بہت سے لوگ آباد ہین،

موقع یہ شہر بغداد کے شمال غربی جانب ۲۰۰ میل کے فاصلے پر آباد ہے، اور یہ مسافت موٹر پر ۹ سے لیکر ۱۱ گھنٹے مین طے ہوتی ہے، شہر دجلہ کے مغربی کنارے پر واقع ہے، اور شہر نینوا اور اسکی فصیل دوسرے کنارے پر ہے، اور تقریباً ایک سال سے وہان نہایت قیمتی آثار دریافت ہو رہے ہین،

باشندے موصل کے زیادہ تر باشندے تو مسلمان ہین لیکن مختلف مذاہب کے عیسائی اور تھوڑے سے یہودی بھی یہان آباد ہین، تیاری جنکو انوری کہتے ہین زیادہ تر شہر کے گرد اپنے مخصوص دیہاتون مین رہتے ہین، موصل کے باشندے صورت اور سیرت دونون مین اہل عراق سے بالکل مختلف ہین، ملک کی برودت کی وجہ سے ان کا رنگ نہایت سرخ و سفید ہے، ان کے اخلاق مین نہایت نرمی پائی جاتی ہے، لیکن جب ان کے مذہب اور عزت پر حملہ کیا جاتا ہے تو وہ نہایت سخت ہو جاتے ہین، فیاضی، شگفتہ روئی اور انس و محبت ان کے فطری خصائل ہین، مذہب اور عزت کے معاملے مین نہایت غیور ہین، دعوت حق کو نہایت سرعت کیساتھ قبول کرتے ہین، اپنے مذہب کو گران سے گران قیمت پر بھی فروخت نہین کرتے، عراق کے اطراف مین جو شہر ہین ان مین عام طور پر بدزبانی پھیلی ہوئی ہے، لیکن یہ لوگ اپنی زبانون کو گالی گلوج سے آلودہ نہین کرتے،

مذہبی پابندی اُن کی مذہبی پابندی کے متعلق صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ ہندوستان کے علاوہ مین نے اور کسی شہر مین یہ نہین دیکھا کہ پبلک باغات مین نماز کی جماعت قائم ہوئی ہو، لیکن موصل اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ مین جادۂ حلب (حلب روڈ) پر ایک قہوہ خانے مین چند علماء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً مؤذن نے قہوہ خانے کے باغ مین "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز دی، ابھی اس کی اذان ختم بھی نہین ہونے پائی

تھی، کہ قہوہ خانے سے لوگ اُٹھ کر ایک مقام کی طرف بڑھے جہان چٹائیان بچھی ہوئی تھین، اور دم بھر مین یہ جگہ اس قدر بھر گئی کہ بعض لوگون کو واپس آنا پڑا، ایک مقرر شدہ امام نے سب کو نماز پڑھائی، اور نماز پڑھنے کے بعد سب کے سب واپس آئے، اور علمی و تجارتی گفتگو مین نہایت متانت و سنجیدگی سے مشغول ہوگئے، نہ کسی قسم کا شور ہوا، نہ کسی قسم کا غل،

اہلِ موصل کی پاکبازی کی یہ کیفیت ہے کہ راستے مین کہین بے حجاب عورتین نظر نہین آتین، صرف مسلمان عورتون ہی کی تخصیص نہین بلکہ عیسائی عورتون کا بھی یہی حال ہے، شراب کے متوالے کہین نہین دکھائی دیتے، خدا اور خدا کے مذہب کو کبھی برا بھلا نہین کہا جاتا، حالانکہ بغداد مین اس قسم کے ناشایستہ کلمے عام ہین، اور باہمی لعن وطعن کا تو کچھ پوچھنا ہی نہین، لیکن موصل مین گاڑیبان تک بھی جو نہایت بدزبان ہوتے ہین، اس قسم کے الفاظ استعمال نہین کرتے،

خصائل عربی مذہب کے بعد اہلِ موصل نے سب سے زیادہ بدویانہ خصائل کو محفوظ رکھا ہے، ان خصائل مین فصاحت، شجاعت، فیاضی، مروّت و حیار وغیرہ خاص طور پر اُن مین موجود ہین، عراق کی زبان مین ہندی اور فارسی الفاظ کی جو کثرت اور لب و لہجے کی جو خرابیان عام طور پر پائی جاتی ہین، اُن سے اہلِ موصل کی زبان بالکل خالی ہے، صرف بعض حروف کے لہجے مین یہ خرابی پائی جاتی ہے،

علماء اور طلبہ موصل کے علماء درس و تدریس مین نہایت مستعدی کیساتھ مصروف رہتے ہین، طلبہ کی زیادہ تر تعداد مالی اعانتون سے بے نیاز رہتی ہے نہ وہ شہر کے باشندون سے طالبِ امداد ہوتے، نہ اُن اوقاف سے فائدہ اٹھاتے، جنکے منافع دولتمند لوگ ناجائز طور پر اپنے اوپر صرف کرتے ہین، باوجود اس کے طلبِ علم مین ہمہ تن مصروف رہتے ہین، ایک عالم نے بہت سی تکلیفین برداشت کر کے اہلِ موصل کو طریقۂ سلف کی دعوت دی اور بدعات سے روکا، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگون کے خیالات سدھر گئے، اور ایک خاص متبعِ سنت جماعت پیدا ہوگئی،

شبان المسلمین یہان نوجوان مسلمانون نے ایک انجمن شبان المسلمین قائم کی ہے، جس مین لوگ نہایت کثرت سے

شریک ہو رہے ہین، لیکن اس شرکت کا مقصد شطرنج، ٹینس اور دوسرے تفریحی مشاغل نہین ہین، اس لئے توقع ہے کہ آیندہ چل کر اس سے نہایت عمدہ مذہبی اور اخلاقی فوائد حاصل ہونگے،

یزیدی فرقہ یہان ایک فرقہ یزیدیہ موجود ہے، جو عرف عام مین یہان "عبدۃ الشیطان" یعنی شیطان کا پوجاری کہا جاتا ہے، جس کی اجمالی تاریخ یہ ہے کہ یہ لوگ عربی النسل ہین، اور خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتے ہین، یزید ابن معاویہ ان کے ہان افضل الانبیاء ہے، ابن تیمیہ کے زمانے تک یہ لوگ شیخ عدی ابن مسافر کے طریقہ کے پیرو تھے، اور ابن تیمیہ نے اُن کو اس طریقہ کی بدعات سے روکنا چاہا تھا، لیکن بعد کو ان کے شیوخ کی جہالت بڑھتی گئی، اور وہ لوگ روز بروز گمراہ ہوتے گئے، معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے غالی شیعون کے مقابلہ مین عدی بن مسافر اموی نے یہ جماعت بنائی جو رفتہ رفتہ اس قدر دور جا پڑی، مجھے اس جماعت کے شیخ سے اس مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا، وہ نہایت اخلاق سے پیش آیا، گفتگو کا موضوع فرقہ یزیدیہ تھا، اس مین اس کے جو عقائد و اعمال معلوم ہوے وہ ملخصاً حسب ذیل ہین

۱- یہ لوگ قرآن مجید کو مانتے ہین اور اس کو پڑھتے ہین، لیکن احکامِ قرآنی کی پابندی نہین کرتے،

۲- انبیاء کے منکر نہین ہین، لیکن یزید بن معاویہ کو اپنا خاص پیغمبر مانتے ہین اور اس کو افضل الانبیاء سمجھتے ہین،

۳- یہ لوگ ابلیس کی عبادت کرتے ہین، مور کی شکل مین اسکا بت بناتے ہین، اس کے سامنے قصائد جو انکی کتاب مقدس ہین پڑھتے ہین، اور اس کے لئے مذہبی مجلسین کرتے ہین، محافل و معابد کے لئے بہت سے اوقاف ہین،

۴- ان کا ایک شیخ ہوتا ہے، جس کا کام پڑھنا، لکھنا اور اس گروہ کی تاریخی کتابون کی حفاظت کرنا ہے، اس شیخ کے علاوہ ہر شخص پر پڑھنا لکھنا حرام ہے، وہ صرف اپنی بڑی اولاد کو تعلیم دے سکتا ہے تاکہ وہ اسکا جانشین ہو سکے،

۵- ایک امیر ہوتا ہے جو ان لوگون پر خود مختارانہ حکومت کرتا ہے، سلطنت انکے اندرونی معاملات مین مداخلت نہین کرتی،

۶- ایک قوال ہوتا ہے جو امام نماز کے فرائض انجام دیتا ہے، یعنی قصائد پڑھتا ہے، اور نماز مین گانے والی جماعت کی امامت کرتا ہے،

عراق مین اُن کی تعداد ۳۰ ہزار ہے، اور شام کے بعض اطراف مین بھی اُن کی ایک جماعت ہے، اور ان کے خیال مین دنیا کے اور حصون مین بھی ان کے ہم مشرب موجود ہین، یہ لوگ کسی فرقہ کو برا نہین کہتے، "ع"

اخبار علمیہ

عراق اور مصر کے اہم اکتشافات

گذشتہ سال شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کی ایک جماعت عراق کے قدیم شہر خورس آباد مین آثار قدیمہ کی دریافت و تحقیق مین مصروف تھی، وہان اُس نے چند ایسی چیزین برآمد کین جو تاریخی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہین، ان مین سب سے زیادہ اہم ایک تختی تھی جس پر سنہ ۲۲۰۰ سے سنہ ۷۵۰ قبل مسیح تک کے تمام اسیرین بادشاہون کے نام ترتیب وار درج تھے، اس تختی کی دریافت سے پہلے ان بادشاہون کا نام تاریخی ترتیب کیساتھ معلوم نہ تھا، معارف کی کسی گذشتہ اشاعت مین اس اہم اکتشاف کی خبر شایع ہو چکی ہے، امسال شکاگو یونیورسٹی کی مہم نے خورس آباد کا ایک نیا حصہ برآمد کیا ہے، یہ عظیم الشان شہر آٹھوین صدی قبل مسیح مین اسیرین قوم کے ایک بڑے تاجدار سارگن ثانی (Sargon II) کا پایۂ تخت تھا جس نے اپنا مرکز حکومت نینوا کے قدیم شہر سے منتقل کرکے یہان قائم کیا تھا، لیکن سارگن ثانی کی وفات پر اس کے جانشین نے نینوا کو پھر دار السلطنت بنالیا اور خورس آباد رفتہ رفتہ ویران ہو کر ریگستان کی خاک مین دفن ہو گیا،

امسال اس شہر کے جو آثار کھود کر نکالے گئے ہین اُن مین سب سے زیادہ نمایان ایک قلعہ ہے جس کے پھاٹک پر بہت خوبصورت کام بنا ہوا ہے، پھاٹک کے دونون طرف پتھر کے دو نہایت عظیم الشان پردار بیل بنے ہوئے ہین، جنکا چہرہ انسانی چہرہ سے مشابہ ہے، یہ بیل اسیرین کلچر کے خاص نمونے ہین، یہ تیرہ فٹ لمبے اور تیرہ فٹ اونچے ہین اور ہر ایک کا وزن بیس ٹن ہے، دونون بالکل محفوظ حالت مین پائے گئے ہین، انہی سے متصل دو پردار دیوون کی تصویرین ہین، جو پتھر مین کھود کر بنائی گئی ہین، یہ دیو بیلون پر تیل کی مالش کر رہے ہین، سارگن کے قدیم محل سے باہر ایک بڑا معبد بھی

پایا گیا ہے، جو سڑک کی سطح سے (۲۵) فٹ اونچے چبوترے پر بنا ہوا ہے، یہ معبد نابو (NABU) کے نام سے موسوم تھا، جو اُس عہد مین مورخین اور مصنفین کا خدا سمجھا جاتا تھا[1]، اس معبد مین (۴۵) سے زیادہ کمرے ہین، اور انہی مین سے ایک کمرہ مین وہ تختی پائی گئی تھی، جس پر اسیریا کے بادشاہون کے نام کندہ ہین، قلعہ کی دو اور عمارتون کے بھی کچھ حصے کھود کر نکالے گئے ہین، لیکن ابھی یہ صحیح طور پر نہین معلوم ہو سکا ہے، کہ ان عمارتون کا استعمال کیا تھا،

عراق کے مذکورۂ بالا اکتشافات کے علاوہ حال مین مصر سے متعلق بھی نہایت اہم معلومات حاصل ہوئے ہین،

برطانیہ کے مشہور ماہر اثریات مصر سر فلنڈرس پٹری (Sir Flinders Petrie) نے رسالہ نیچر کی ایک قریبی اشاعت مین ان نو دریافت شہادتون کا ذکر کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر پر قاف کے باشندون نے کم سے کم چھ بار حملے کئے، ان مین سے پہلا حملہ اسوقت ہوا جب مصرانی تہذیب کے ابتدائی دور مین تھا، اور آخری حملہ موصوف کی رائے مین سلطان صلاح الدین کے زمانہ مین ہوا، غزہ مین سر فلنڈرس نے جو آثار قدیمہ برآمد کئے ہین ان مین ایک خاص قسم کے خنجر اور چند ایسی چیزین بھی ملی ہین جو قاف اور بحر کاسپین کے ملحق علاقون کی مخصوص چیزین ہین، غزہ جنوبی فلسطین مین واقع ہے، لیکن غزہ اور مصر کی تاریخ مین ہمیشہ بہت قریبی تعلق رہا ہے، اور وہان کے آثار سے یہ انکشاف ہو گیا ہے کہ غزہ قوم ہائکسوس (Hyksos) کا ایک عظیم الشان شہر تھا، یہ جنگجو سوار سر فلنڈرس کی تحقیق کے مطابق، بحر کاسپین کے نشیبی علاقون سے نکل کر لڑتے ہوئے مغرب کی جانب شام مین داخل ہوئے اور وہان سے جنوب مین غزہ پہنچے، غزہ مین کچھ دنون قیام کرنے کے بعد سنہ ۱۹۰۰ قبل مسیح کے قریب وہ مصر مین داخل ہوئے اور راعی سلطان[2] (Shepherd King) کے لقب سے مصر کے تخت پر قابض ہو گئے، سر فلنڈرس نے لکھا ہے کہ مصر پر باشندگان قاف کے متعدد حملون کی تصدیق مصری قصص الاصنام (Mythology) خصوصاً مشہور کتاب الموتی

---

۱ معارف :- یہ وہی نابو ہے جسکا معروف نام عطارد ہے، جسکو اسی لئے دبیر فلک اور منشی فلک کا لقب دیا جاتا ہے، جو آج تک قصیدہ نویس شعراء کی زبانون پر جاری ہے، ۲ معارف :- قوم ہائکسوس کا قاف سے متعلق ہونا ایک نیا نظریہ ہے جو بہت کچھ محتاج ثبوت ہے، ہائکسوس بدوی عرب تھے، اس کے دعوی کے دلائل ارض القرآن جلد اول مین مذکور ہین،

سے بھی ہوتی ہے، مثلاً مصر میں مردون کے خدا اوسائرس (Osiris) کا پایۂ تخت اکریت (Akrel) تھا اور قاف کا یونانی پایۂ تخت اکریلیکے (Ekrelike) تھا، مصریون کی مقدس اور زرخیز سرزمین وادی ایارو (Aaru) تھی جس کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ اس مین آگ کی بڑی بڑی جھیلین ہین، قاف کی زرخیز وادی کا نام آیورا (Aora) ہے، اس مین پٹرولیم کے چشمے ہین اور ممکن ہے کہ قدیم زمانہ مین آگ کی جھیلین بھی رہی ہون،

امریکہ مین جرائم کی کثرت

امریکہ اپنی اعلیٰ "تہذیب" کے علاوہ جرائم کی کثرت کے لحاظ سے بھی دنیا کے "متمدن" ممالک مین ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، وہان نئے نئے جرائم جس تیز رفتاری کے ساتھ پیدا ہو رہے ہین انکی نظیر کسی دوسرے ملک مین مشکل ہی سے ملیگی، ان جرائم کی کثرت کا اندازہ "بارہ ارب ڈالر" کی خطیر رقم سے ہوتا ہے، جو حسب روایت لٹریری ڈائجسٹ (۲۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء) ریاستہائے متحدہ مین انسداد جرائم کے مصارف کا سالانہ اوسط ہے، ہر سال جرائم کی روک تھام مین اتنی کثیر رقم کے صرف کرنے کے باوجود ان مین روز بروز ترقی ہی ہوتی جاتی ہے اور یہ مسئلہ قوم کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ بن گیا ہے،

چنانچہ اٹرنی جنرل ہومر کمنگز (Homer S. Cummings) کی تحریک سے واشنگٹن مین ایک قومی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، جسکا اجلاس ۱۰ دسمبر سے ۱۳ دسمبر تک ہوگا، اس کانفرنس مین صدر امریکہ تقریر کرینگے، اس کی شرکت کے لئے تمام ریاستون کے گورنرون کو دعوت دی گئی ہے، نیز تمام قومی انجمنون مثلاً قانونی، طبی، عمرانی، سائنٹفک، تعلیمی، مذہبی، صحافتی، وغیرہ وغیرہ کو دعوت نامے بھیجے گئے ہین، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری حلقے متحد ہو کر انسداد جرائم کی تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کرین، اور باہمی اشتراک عمل سے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرین جس سے یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے، کیونکہ یہ بات اب عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ گھر، کلیسا، اور مدرسے جرائم کی روک تھام مین ناکام ثابت ہوئے، اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر کینٹر (N. CANTOR) نے فرمایا کہ انسان اپنے لئے جو راہ عمل اختیار کرتا ہے، اس مین دخل زیادہ تر اتفاق کو ہوتا ہے نہ کہ ذاتی پسند کو، چنانچہ موصوف کی رائے ہے کہ مجرم صرف اسلئے مجرم ہے کہ اس کے ماحول اور گردوپیش کے حالات نے اسے جرم کرنے پر مجبور

کیا ورنہ حقیقۃً اس کی یہ زندگی نہ خدا کی مرضی کے مطابق ہے اور نہ شیطان کے وسوسہ کی بناپر،

حال تک یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ جرائم کا اصلی گہوارہ بڑے بڑے شہرون کی تنگ و تاریک گلیان ہین اور اسی بناپر امریکہ مین ایسی گلیون کو ویران اور اُن کے مکانات کو مسمار کر دینے کی ایک عام تحریک جاری ہو گئی تھی لیکن اسی سلسلہ مین ان گلیون کی تحقیق کرنے والے اس نتیجہ تک پہنچے ہین کہ ماحول لازمی طور پر جرائم کا باعث نہین ہوتا، انکی تفتیش و تحقیق سے یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے کہ جرائم صرف ایسی گلیون ہی مین پیدا ہوتے ہین یا مجرم صرف اپنے ماحول ہی سے مجرم بنتا ہے، انھون نے اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ حال کے بڑے بڑے مجرم زیادہ تر دیہاتی رقبون یا شہر کے متمول حصون کے رہنے والے تھے، وہ ماحول کی اہمیت کو نظر انداز نہین کرتے لیکن ان کا خیال ہے کہ جرائم مین انسان کی ذاتی فطرت کو بہت کچھ دخل حاصل ہے،

دنیا کی سب سے بڑی دوربین

اسوقت دنیا کی سب سے بڑی دوربین رصد خانہ ماؤنٹ ولسن کیلیفورنیا (امریکہ) مین ہے، اسکے شیشہ کا قطر سو انچ ہے، جب یہ دوربین تیار ہوئی تھی اسوقت بہت کم لوگون کو خیال تھا کہ کوئی اس سے بھی بڑی دوربین بنائی جا سکتی ہے، لیکن اس دوربین نے کائنات کا جو وسیع حصہ آنکھون کے سامنے کر دیا اس سے ہیئت دانون کا حوصلہ اور بڑھ گیا، اور چند سال ہوئے امریکن ہیئت دانون کی ایک جماعت بعض جرمن اور انگریز ہیئت دانون کی مدد سے ایک ایسی دوربین کا نقشہ تیار کرنے بیٹھی جسکے شیشہ کا قطر دو سو انچ ہو،

حال مین یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ نیویارک کے ایک کارخانہ (CORNING GLASS WORKS) نے اتنا زبردست شیشہ تیار کر لیا ہے اور اسکا وزن ۲۰ ٹن ہے، اسی پیمانہ کا ایک دوسرا قرص بھی عنقریب تیار کیا جانے والا ہے تاکہ اگر پہلے قرص مین کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو یہ دوسرا دوربین مین لگا دیا جائے، اس دوربین کو نصب کرنے کیلئے ماؤنٹ ولسن کے قریب کسی پہاڑی پر ایک دوسرا رصد خانہ تعمیر کیا جائیگا جسکے مجموعی اخراجات کا تخمینہ دس لاکھ پونڈ سے زیادہ کیا جاتا ہے، موجودہ سب سے بڑی دوربین سے جتنی دور دیکھا جا سکتا ہے، یہ نئی دوربین اس سے چوگنا زیادہ دور دیکھ سکیگی، سو انچ قطر والی دوربین سے تقریباً (۱۵۰۰۰۰۰) ستارے دیکھے جا سکتے ہین، اور انکی تصویر لی جا سکتی ہے، لیکن اس نئی دوربین کی تیاری کے بعد توقع کیجاتی ہے کہ یہ تعداد (۲۰۰۰۰۰۰۰) تک پہنچ جائیگی،

"ع ز"

ادبیات

کلامِ امجد

از

حکیم الشعرا جناب امجد حیدرآبادی

حاملِ بارِ امانت، ظالم و جاہل بنا ۔ اللہ اللہ مجھ سا نا قابل بھی اس قابل بنا،

عشق کا خنجر، رگِ جاں پر لگا روزِ ازل ۔ ایک قطرہ خون کا اس سے ٹپک کر دل بنا

"تعرف الاشیاء بالاضداد" ثابت ہوا ۔ ذاتِ حق کی معرفت کے واسطے باطل بنا

آج جو کرتا ہوں میں، پاتا ہوں کل اسکی جزا ۔ ماضیہ افعال ہی سے میرا مستقبل بنا

مل ہی جائے گا کوئی ہمدرد آخر! ایک دن ۔ پہلے اپنے دل کو امجد! درد کے قابل بنا

مشرق و مغرب

از جناب اسد ملتانی

پوچھا یہ میں نے ایک حکیمِ فرنگ سے ۔ انصاف کا یہ کونسا معیار ہے کہ یوں

مغرب کی پستیوں کو کہا جائے سربلند ۔ مشرق کی رفعتوں کو کیا جائے سرنگوں

مغرب میں جس کو جذبۂ ملت قرار دیں ۔ مشرق میں ہو وہی تو کہیں مذہبی جنوں

مغرب میں ہو قتال تو وہ جہد للبقا ۔ مشرق میں ہو جہاد تو بیہودہ کشت و خوں

مغرب میں فتنہ گر کو بھی آزادیٔ زباں ۔ مشرق میں راست گو کی بھی اک حرکتِ نیوں

مغرب میں وہم و خبط کی بھی قدر دانیاں ۔ مشرق میں علم و فضل کی قسمت بھی واژگوں

مغرب میں داستان بھی تاریخ کا مواد ۔ مشرق میں واقعات بھی افسانہ و فسوں

مغرب میں تو ہوس بھی ہو فطرت کا اقتضا ۔ مشرق میں جوشِ عشق بھی ٹھہرے فسانِ خوں

مغرب میں شغلِ رقص بھی تہذیب کا نشاں ۔ مشرق میں وحشیانہ ہر اک حرکت و سکوں

بولے نہیں یہ مشرق و مغرب کا امتیاز ۔ ہے یہ تو صرف سطوتِ ظاہر کا اک فسوں

طاقتوروں کی عقل کے معیار میں اسد

کمزور کو کہاں ہے مجالِ چرا و چوں

حقیقتِ مسلم

از جناب محمد سعید ہوشیارپوری،

جو بوالہوس ہیں، وہ مجکو سمجھ نہیں سکتے ۔ شہیدِ ناز ہوں میں کشتۂ وفا ہوں میں،

زمانہ لا نہ سکا جس کی تابِ جولانی، ۔ اسی مجاہدِ اعظم کا نقشِ پا ہوں میں،

محالِ عقل ہے عالم سے میرا مٹ جانا، ۔ کہ آفرینشِ عالم کا مدعا ہوں میں،

میں بے نیاز ہوں قطع و برید کے غم سے ۔ جو راست ہے قدِ فطرت پہ وہ قبا ہوں میں،

میں ترجمانِ حقیقت ہوں رازِ استقلال ۔ تغیرات کی حد سے نکل چکا ہوں میں،

مرے مقام سے اونچا نہیں کسی کا مقام ۔ کمالِ اوج ہوں رفعت کی انتہا ہوں میں

جو کہہ رہا ہوں میرے پاس اسکی حجت ہے ۔ مآلِ کار کو گویا کہ دیکھتا ہوں میں،

کروں گا مشرق و مغرب کو پھر میں زیرِ نگیں ۔ زمانہ دیکھ ہی لے گا جو کہہ رہا ہوں میں

میرے محاذ سے کہہ دو ہوس پرستوں کو ۔ کھڑے ہوں ہٹ کے کہ اک تیرِ بے خطا ہوں میں

میری گرفت سے دنیا نکل نہیں سکتی، ۔ زبانِ وقت بتا دے گی ہاں! کہ کیا ہوں میں

تابشِ سہیل،

از جناب اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے (علیگ) ایڈوکیٹ اعظم گڈھ،

فطرت کریگی شاید تجدید رنگ و بو کی
قربانگہِ محبت جو یا ہے پھر لہو کی

اللہ ری بہاریں فردوسِ آرزو کی
خلوتکدے مین دل کے دنیا ہے رنگ و بو کی

بادِ بہار بسمل ہے کس کی جستجو کی
ہر برگِ گل حکایت ہی خونِ آرزو کی

خنجر نے کس کے دی ہے دعوت رگِ گلو کی
ہے رقص بیخودی مین جو بوند ہے لہو کی

غم ہے اساس فطرت دنیاے رنگ و بو کی
شبنم کے اشک سے ہین تر دستیان نمو کی

کیا کیجیے شکایت بے مہری عدو کی
دیکھی ہے مہربانی یارانِ فتنہ جو کی

سرشاریان نہ پوچھو آغاز آرزو کی
دل تھا کہ کوئی مینا صہباے مشکبو کی

صبحِ ازل کسی نے چھیڑا تھا نیشتر سے
بسمل پھڑک رہی ہے ابتک رگِ گلو کی

دل کی بہار کیا ہے غم سے فگار رہنا
زخمِ جگر کو گل کے حاجت نہین رفو کی

کہنے کو لاکھ کہئے سنتا ہے کب کہانی
حسن گرہ برابر و عشقِ نیاز خو کی

اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گامزن ہو
ہر سمت سے صدائین آتی ہین طرقوا کی

شاید حیات اسی کو کہتے ہین دہر والے
ہوتی ہے اک چبھن سی رگ رگ مین آرزو کی

اے انقلاب گردون بہتی رہیگی کب تک
عشق و فا منش سے حسن بہانہ جو کی!

گم کردۂ طلب ہوا اب بے نیاز منزل
اب جا کے حد ملی ہے صحراے جستجو کی

یارب وہ چشم فتان ساقی رہیگی تا کے
ٹکرا رہیگی کب تک پیمانہ و سبو کی

سجدے بھی ناتوان کے ہوتے نہین پذیرا
فریاد کون سنتا اقبالِ تلخ گو کی

مطبوعات جدیدہ

مخزنِ شعراء، مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی اے، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، ۲۰۰ صفحات، قیمت مجلد عہ/ غیر مجلد ۱۲/

یہ گجرات کے اردو زبان کے شعراء کا تذکرہ ہے، اس کے مصنف قاضی نور الدین حسین خاں رضوی فائق ہیں، زمانہ تالیف ۱۲۶۳ھ ہی، گجرات سے اردو زبان کا تعلق اسی طرح رہا ہو جیسے دکن پنجاب اور دتی وغیرہ سے، قدیم دکھنی شعراء کی طرح گجراتی شعراء کی تصنیفات و دواوین بھی گجراتی اردو میں ہیں، محافل میں کبھی کبھی گجراتی شعراء کا تعارف کرایا گیا ہو، اس زمانہ میں اگرچہ گجرات میں گجراتی زبان یہاں کی ملکی زبان سمجھی جاتی ہو اور یہاں سے اردو شعر و سخن کا چرچا اٹھتا جاتا ہو، مگر مخزنِ شعراء کو دیکھکر حیرت ہوئی، کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں گجرات میں اردو زبان ایسی شُستہ تھی جیسے اردو کے دوسرے مرکزوں کی زبان، مصنف مخزنِ شعراء نے قدیم گجراتی شعراء کا تذکرہ نظر انداز کر دیا ہو، اور بارھوین صدی کے شعراء کے صرف وہی اشعار لیے ہیں، جو عربی و فارسی آمیز گجراتی زبان سے پاک ہیں، اس لحاظ سے یہ حیرت کی بات ہو کہ اس تذکرہ میں اچھے اور بلند پایہ شعراء کے کافی نام جمع ہوگئے ہیں، اور ان کے منتخب اشعار کی زبان، محاورہ اور انکی شاعری اس عہد کے دلی اور لکھنؤ کے شعراء سے کسی طرح فروتر نہیں، اور بعض ان میں بھی استادانہ حیثیت رکھتے ہیں، کیا آج باشندگان گجرات متحدہ قومیت و وطنیت کے نام پر اس مشترکہ زبان پر نئے سرے سے توجہ نہیں کر سکتے، جو مدتوں ان میں پھلی پھولی اور انکی ترقی میں ان کے اسلاف کے کارنامے اور احسانات ہیں،

تذکرہ پر حسب معمول مولوی عبد الحق صاحب کا مقدمہ ہے، اسمیں ولی کے دکھنی و گجراتی ہونے کی بحث تازہ کیگئی ہو، مقدمہ نگار کا رجحان ولی کے گجراتی ہونے کی جانب مائل ہی، اس کے قوی دلائل بھی درج کئے ہیں، کہ بعض اہلِ تذکرہ نے

ولی کو دکھنی لکھنے کے باوجود اسے مولداً گجراتی بتایا ہے، اور عمر کا بڑا حصہ احمد آباد میں صرف ہوتے دکھایا ہے، کہ شمالی ہند والوں کی اصطلاح میں دکھن سے مراد گجرات، اور حیدرآباد وغیرہ کا پورا خطہ تھا،

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، از مولوی عبدالحق صاحب بی اے، معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۲۳ صفحات،

یہ مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مقالہ ہے، پہلے علی گڈھ میگزین میں چھپا تھا، اب نظر ثانی کے بعد رسالہ کی شکل میں شائع ہوا ہے، اسمیں مرہٹی زبان پر فارسی زبان کے اثرات دکھائے ہیں، یہ خیال سب سے پہلے معارف میں "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیم" کے سلسلہ میں ظاہر کیا گیا تھا، اور اسکی طرف مختصر اشارات کئے گئے تھے، مولوی صاحب نے اپنی قابلِ قدر تحقیقات سے ان اثرات کی پوری تشریح فرمائی ہے، انھیں یوں سمجھنا چاہئے کہ مثلاً موجودہ زمانہ میں اردو زبان پر انگریزی زبان کے اثرات کا مطالعہ اگر کیا جائے تو ان اثرات کے پڑنے کے جو اسباب ہوں گے وہی فارسی کے اثرات مرہٹی پر پڑتے گئے ہیں، مؤلف نے مرہٹی زبان کی عبارتوں، جملوں، ضرب الامثال، اور مفرد الفاظ کو علیحدہ علیحدہ نمونہ کے طور پر درج کر کے ان میں فارسی زبان کے اثرات کی مثالیں دی ہیں، مرہٹی زبان کے حروف عطف و ربط، مرکب مصادر، اور مشتقات میں بھی فارسی زبان دخیل نظر آتی ہے، پھر دکھایا ہے کہ مرہٹی زبان سے فارسی کے اثر کو خارج کرنے کی کوشش شیواجی نے کی، پھر یہ تحریک تلک کے زمانہ میں اٹھی، مگر تلک نے شدومد سے اسکی مخالفت کی،

حضرت امجد کی شاعری، از جناب نصیر الدین ہاشمی مولف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" جام باغ تربیہ بازار حیدرآباد، دکن، ۸۰ صفحات قیمت عمر

حضرت امجد حیدرآبادی کو معارف نے حکیم الشعراء کے لقب سے یاد کیا، اور ان کا یہ لقب ملک کے سنجیدہ ادبی حلقہ میں مقبول ہوا، ان کا کلام معارف کی اس اشاعت میں بھی درج ہے، اس رسالہ میں ان کی شاعری کے محاسن دکھائے گئے ہیں، اور مختلف اصناف سخن کو نمونہ کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ابتدا میں موصوف کے مختصر سوانح حیات درج ہیں، اور رسالہ

کا پیش لفظ سر امین جنگ بہادر نے لکھا ہے،

جنگ نامۂ عالم علی خان، مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے، ناشر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۸۰ صفحات، قیمت ۸ر

جس زمانہ میں دہلی کے سلاطین سادات بارہہ کے اثر و اقتدار میں تھے، نظام الملک اول کو ان سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا، سید عبداللہ قطب الملک نے اپنے بھتیجے عالم علی خان کو اسکی سرزنش کیلئے مامور کیا، ان دونوں کی لڑائی ۱۱۳۲ھ میں پیش آئی جسمیں سید عالم علی خاں مارا گیا، یہ رسالہ اسی لڑائی کی منظوم تاریخ ہے، اس کا ناقص نسخہ مسٹر ولیم ارون نے رسالہ انڈین اینٹی کیوری بابت ماہ جنوری ۱۹۰۴ء میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا، مصحح نے قیاسی دلائل سے اس رسالہ کے مصنف کی تعیین کی تھی، مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا مکمل نسخہ ملا، اس کے آخری شعر میں مصنف کا نام غضنفر حسین موجود ہے، جس سے مسٹر ولیم کی تحقیق کی تردید ہو گئی، جنگ کے واقعات تاریخ کی مستند روایتوں کے مطابق ہیں، اس لئے یہ ولی دکھنی کے عہد کی اردو کی ایک منظوم و مستند تاریخ ہے،

ترکوں کی اسلامی خدمات اور اُن کی زبان و ادبیات، ناشر انجمن ترقی اردو، ۱۳۵ صفحات، قیمت عہ،

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بڈاپسٹ یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں تین خطبے ترکوں کی زبان و ادب پر دئے تھے، ان کا ترجمہ جناب سید وہاج الدین صاحب بی اے نے کیا ہے، ترکی ادبیات کی نسبت ہماری زبان میں بہت کم سامان ہے، اسلئے بھی یہ مقالہ قابلِ مطالعہ ہے،

خلق عظیم، از جناب قاضی ظہور الحسن صاحب سیوہاروی، بہ مکان مولوی فیض الدین ایڈوکیٹ، محلہ عابد شاہ، حیدرآباد دکن، ۴۲ صفحے، ۴ر

جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم نے سیرت نبوی کے مختلف واقعات چھوٹی چھوٹی نظموں میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے، ان کا مجموعہ خلق عظیم کے نام سے شائع کیا ہے، نظمیں سلیس اور انداز بیان دلنشیں ہے، واقعات و روایات مستند ہیں،

اور حتی الوسع مبالغہ سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے،

گلہاے جعفری، ناشر نگار بک ایجنسی، لکھنؤ، ۴۸ صفحے، تقطیع جیبی، قیمت ۴ر

جناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، ڈپٹی کلکٹر کے اشعار کا انتخاب جناب نیاز فتحپوری نے کیا ہے، دیباچہ میں دکھایا ہے کہ وہ لکھنوی شاعری کے مخالف ہیں، لیکن اثر کی شاعری کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ وہ لکھنوی نہیں ان دس بیس منتخب شعروں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے،

اصنام خیالی، از جناب جلیل احمد قدوائی، ایم اے، ۲۵۱ صفحات، عار، ناشر کتابستان نمبر ۱۷، سٹی روڈ الہ آباد،

یہ جناب جلیل احمد قدوائی کے مختصر افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے، یہ افسانے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اون میں سے اکثر ماخوذ و ترجمہ اور بعض طبعزاد ہیں،

سمن پوش، از جناب مجنوں گورکھپوری، ۱۹۸ صفحات، عہ ر، ناشر ایوان اشاعت گورکھپور،

یہ جناب مجنوں گورکھپوری کے روحانیات کے موضوع پر چند مضامین اور چند افسانوں کا مجموعہ ہے، یہ مضامین لکھنؤ کے روحانیات کے رسالہ "جن" میں جس کے متعلق اس مجموعہ سے پتہ چلا کہ موصوف ہی اسکے اصل روح رواں تھے، شائع ہو چکے تھے،

دل کی رانی، از جناب فرید پھلی شہری، ناشر ملت بک ڈپو، دہلی، قیمت ۴ر

یہ بھی اک افسانہ ہے اسمیں ایک نوجوان برہمن کا ذات پات کی بندشوں کو توڑ کر ایک اچھوت لڑکی سے شادی کرنے کی روداد دلپذیر انداز میں لکھی گئی ہے،

آئین برطانیہ، از جناب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری، ال ال ڈی، بار ایٹ لا، ناشر باغ و بہار بکڈپو دہلی، ۴۸ صفحات، تقطیع چھوٹی قیمت ۸ر

جناب سید نجم الدین احمد صاحب جعفری، ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن حکومت ہند نے انگلستان کی آئینی قیود پر اردو کے ایک پرچہ میں ایک سلسلہ مضمون لکھا تھا، اُسے اب آئین برطانیہ کے نام سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے،

اس میں حکومت انگلستان کے آئین، اسکی ترتیب انگلستان کی سیاسی جماعتوں اور دستوری ترقیوں پر اختصار کے ساتھ عام فہم انداز میں روشنی ڈالی ہے، اس رسالہ کے پڑھنے سے ہندوستان کے سیاسی حالات کے سمجھنے میں بھی امداد ملے گی،

قانون وقف علی الاولاد، مرتبہ جناب محمد اسمٰعیل حنیفی ایڈوکیٹ میرٹھ، ۲۰ صفحات، قیمت ۲ر

اس رسالہ میں قانون وقف علی الاولاد (ایکٹ نمبر ۶ ۱۹۱۳ء) کا پورا ترجمہ مع تشریح درج ہے، ابتدا میں اس قانون کے عالم وجود میں آنے کی تاریخ اور اس کے مقاصد و فوائد سمجھائے گئے ہیں، تعجب ہے کہ اس میں علماے ہند کی ان مساعی کا تذکرہ نہیں آیا، جو مولانا شبلی مرحوم کی سرکردگی میں انجام پائیں، گو مسٹر جناح تو اس کو اسمبلی میں پاس کرانے والے تھے، لیکن ابتداءً اسکی تحریک کرنے اور قوم و ملک سے اس کی حمایت حاصل کرنے کی تمام کوشش ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی نے انجام دی تھی،

اقوال الشریفہ فی نکات الکلمۃ الطیبہ، (حصہ اول) از مولوی شاہ محمد سلیم اللہ صاحب صابری، محلہ پہاڑ پور اعظم گڈھ، ۲۲۴ صفحے قیمت عار

یہ رسالہ بریلوی جماعت کے بعض عقائد کے اثبات میں ہے، مثلاً آنحضرت صلعم کی بشریت سے انکار، قیام میلاد کا جواز، روحوں کا مکانوں میں نذر قبول کرنے کیلئے آنا، عرس و اعراس کا جائز ہونا، فاتحہ و نیاز کا احادیث، سنن اور صالحین کے اقوال سے ثابت ہونا دکھایا گیا ہے، اور محدثین دہلی و علماے دیوبند کے فتاوی کے رد کرنے کی کوشش کیگئی ہے، ثبوت کی اکثر حدیثیں موضوع، متروک اور ضعیف ہیں، مستند اور صحیح حدیثیں بھی دعوی کے ثبوت میں درج ہیں، لیکن اُن کا نفس دعوی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، شاہ صاحب نے ضمناً اپنے واردات بھی لکھے ہیں، مثلاً انکا ۱۳۲۸ھ میں کلیر میں حضرت مخدوم صابر سے "دعاے حیدری شریف" کی تعلیم و تلقین حاصل کرنا، رسالہ اس لحاظ سے لائق تعریف ہے کہ مناظرات میں ہونے کے باوجود اس کا لب و لہجہ نرم اور شیریں ہے، رسالہ کی زبان قدیم وضع کی ہے،

المسیح الدجال و یاجوج و ماجوج

از مولانا محمد علی صاحب، ایم اے امیر جماعت احمدیہ

احمدیہ بلڈنگ لاہور، ۱۰۰ صفحے، قیمت مع محصول ۵ر

کتب احادیث میں مسیح موعودؑ کے پہلو بہ پہلو "مسیح دجال" کی حدیثیں بھی لکھی ہوئی ہیں، اور ان دونوں کے ظہور کا زمانہ ایک ہی بتایا گیا ہے، اسلئے جب ایک جماعت نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے مختلف دعاوی میں سے ایک دعوی یعنی ان کے مسیح موعود ہونے کو تسلیم کر لیا، تو لازماً مسیح دجال کے ظہور کا بھی یہی زمانہ قرار پا گیا، لیکن کسی شخص واحد کو مسیح دجال بتانا ممکن نہ تھا اسلئے ایک دوسری راہ اختیار کیگئی، بعض مفسرین نے جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے یاجوج و ماجوج سے ترکوں کو مراد لیا ہے، سر سید احمد خاں مرحوم نے بھی یہی کیا ہے مولوی محمد حسن صاحب امروہوی مرحوم نے اپنی تفسیر شاہی میں جو ۱۲۹۳ھ میں چھپی ہے، ان سے روس و انگریز کو مراد لیا ہے، اور تعجب یہ ہے کہ اسی زمانہ میں انھوں نے انگریزوں کے بیت المقدس پر قابض ہوجانے کی پیشنگوئی کی تھی جو حرف بحرف پوری ہوئی، (تفسیر شاہی جلد اول ص ۴۳) احمدی دوستوں کیلئے یہ سہارا کافی تھا، انھوں نے مسیح دجال سے متعلق احادیث کو بھی انھی پر منطبق کیا، اور تاویلات کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر لی، اسی کا بیان اس رسالہ میں آیا ہے لیکن اس سوال کا حل نظر نہیں آیا کہ اگر مسیح دجال سے مراد شخص واحد نہیں بلکہ مستولی ہونے والی اقوام ہیں، تو مسیح موعود کا مصداق کیوں نہ وہ امت صالحہ قرار پائے جو توحید و رسالت اور اسلام کے بھولے ہوئے اساسی اسباق کو اپنے عمل سے دوبارہ زندہ کرے، اور یہ عجیب لطیفہ ہے، کہ چودھویں صدی کے "مسیح موعودؑ" کی یہ امتیں ایک طرف انگریزوں کی حکومت برطانیہ کو مسیح دجال کی حکومت ثابت کرتی ہیں، اور دوسری طرف جہاد بالسیف کو منسوخ قرار دیکر اسی "مسیح دجال" کی حکومت کی اطاعت سرزمین ہند میں فرض اور واجب بتاتی ہیں،

نظریۂ مہدی

از جناب ایم حسن لطیفی (اجرنسٹ) دفتر "مطالعہ شاطو" و کنیلڈر روڈ، لدھانہ قیمت ۳ر

اس رسالہ میں چودھویں صدی میں ایک نئے مہدی کے آنے کی بشارت دیگئی ہے، جو پنجاب کے "ارض لدّ" یعنی مقام لودھیانہ سے ظہور کریگا، زمانہ ظہور ۱۳۴۵ھ بتایا گیا ہے، سردست "مبشر" خود آیندہ اپنی مہدویت کے دعوی سے

اوسی طرح انکار کرتا ہے، جیسے مرزا غلام احمد صاحب نے ابتداءً نبوت و رسالت کے دعوی سے انکار کیا تھا، اس رسالہ کے مضامین پہلے پنجاب میں اشتہاروں کی شکل میں نکلے، جب اون کی مخالفت کی گئی، تو مرتب رسالہ کی زیادہ ہمت بڑھی، اور انھوں نے اونہی مضامین کو مبسوط رسالہ کی شکل میں شائع کیا، ہماری اولین غلطی یہی ہوتی ہو کہ ایسے لٹریچر پر مخالفانہ ہی سہی مگر توجہ کیجاتی ہو،

دعوتِ عمل

از مولانا محمد عبد الحامد صاحب قادری بدایونی، مولوی محلہ بدایون، ۵۰ صفحے، قیمت ۴ر

اس رسالہ میں قرآن مجید کی آیتوں کے ذریعہ مسلمانوں کو اخلاق و عمل کی درستی کی دعوت دی گئی ہو، ہر آیت ایک عنوان کے ماتحت ہے، ایسے رسالوں کی اشاعت مسلمانوں کیلئے مفید ہوگی،

کرامات

ترجمہ جناب بلیح آبادی، ہند بک ایجنسی نمبر ۲۰، چتر نجن ایونیو کلکتہ ۹۰ صفحے، قیمت ۲ر

یہ علامہ ابن تیمیہ کے کسی رسالے کا ملخص ترجمہ ہے، اس میں اولیا کی کرامتوں کی صداقت تسلیم کی ہو، اور ان کے نتائج کے اعتبار سے ان کے مفید و مضر ہونے کے پہلو دکھائے ہیں، اور نتیجۃً بتایا ہو کہ کرامات کے ظہور کی قوت پیدا کرنے کیلئے مجاہدہ و ریاضت کرنا دینداری کیلئے سودمند نہیں،

خوارق عادات

از مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی، ناشر مجلس علمی جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل، سملک (سورت) ۴۱ صفحے،

اس رسالہ میں انبیا کے معجزوں اور اولیا کی کرامتوں کو ثابت کیا گیا ہو، اور عقلی دلائل سے منکرین کا رد کیا گیا ہے،

الرّوح فی القرآن

از مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی، مجلس علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک (سورت) ۴۰ صفحے،

یہ رسالہ روح کی حقیقت کے بیان میں ہو، جمہور اہل شرع کے مسلک میں روح کو صوفیہ کے اجسام مثالیہ کے مترادف بتایا

مرنیکے بعد کیا ہوگا

از جناب حکیم محمد یوسف صاحب حضروی مدیر شفا نمبر ۹۰۱۷ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ،

لکھنؤ کے ایک رسالہ میں حیات بعد الممات کا انکار کیا گیا تھا، اس رسالہ میں اسکی تردید کی گئی ہو،

صدائے ایمان، از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ | ناشر مجلس علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، سملک (سورت)
نور ایمان، از مولوی بدِ عالم دیوبندی | حجم مجموعی ۱۵ صفحے،

یہ دونون رسالے ایک ہی سرورق کے اندر چھپے ہیں، اور دونوں قادیانیوں کے بعض ادعاوں کے جواب مین ہین

اعجاز القرآن، از مولوی محمد یٰسین صاحب نجم ہلالی، ناشر جناب شمس النبی محلہ داود سرائے سہارنپور، ۹ صفحے،

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی نے "حقائق القرآن" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا تھا، اسمین آنحضرت صلعم پر معاندانہ اعتراضات کئے گئے تھے، اس رسالہ میں انکے مدلل جوابات درج ہیں، رسالہ کو ناشر نے افادۂ عام اور تبلیغ کیلئے مفت شائع کیا ہے، ناشر سے طلب کیجئے،

عثمانی قاعدہ، از جناب واحد خانم ۴۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، پتہ:- کلیۃ القرآن نرسمہا راجہ روڈ، بنگلور،

یہ بچون کو قرآن مجید پڑھانے کا قاعدہ ہے، جو تعلیم کے نئے اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے، شاید بنگلور کے اسلامی مدرسوں میں داخل ہے، وہان کے علما کا بیان ہے کہ یہ مفید ثابت ہوا ہے،

طریقۂ تعلیم مطالعۂ قدرت، از جناب جگ موہن لال چترویدی، لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج، حیدرآباد، دکن، ۱۰۰ صفحے تقطیع چھوٹی، قیمت عہر،

اس کتاب میں لائق مصنف نے بچوں کو مطالعۂ قدرت (نیچر اسٹڈی) کی تعلیم دینے کے طریقے بتائے ہیں، پہلے مطالعۂ قدرت کے معنی ومفہوم اور اسکی تعلیم کے فوائد بتائے ہیں، پھر مختلف عمر کے بچوں کو تعلیم دینے کے طریقے جداگانہ بیان کئے ہیں، اسکے بعد ۳۰ مختلف جاندار اور بے جان چیزون پر سبق لکھے ہیں، یہ کتاب نہ صرف اسکول کے اون اساتذہ کیلئے جو اسکی تعلیم دیتے ہیں، مفید ہوگی، بلکہ جن لوگون کے سپرد کم عمر بچوں کی نگرانی ہے، ان کے لئے بھی سود مند ثابت ہوگی،

چڑیا گھر، از میاں سلطان احمد دجودی، ایم آر، اے ایس، "رکن دار المصنفین اعظم گڈھ" (؟) ۵۶ صفحات، قیمت ۴ر پتہ:- نظامیہ بٹالہ (پنجاب)

اس رسالہ میں چھوٹے بچوں کیلئے نصیحت آمیز اخلاقی قصے لکھے گئے ہیں، یہ قصے زیادہ تر انگریزی ریڈروں سے ماخوذ ہیں،

"س"

دار المصنفین کی ادبی کتابین

شعر الہند حصۂ اوّل، جس مین قدما کے دور سے لیکر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۴۹۶ صفحے قیمت ہے، (از مولٰنا عبد السلام ندوی)

حصۂ دوم - جس مین اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۹ صفحے، قیمت :- للعہ

گلِ رعنا، اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اردو مین شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جس مین آبِ حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی واکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۸ صفحے، قیمت ۶ر، مصنفہ از مولٰنا سید عبد الحئی صاحب مرحوم،

مکاتیب شبلیؒ - مولٰنا شبلی مرحوم کے دوستون، عزیزون، شاگردون کے نام خطوط کا مجموعہ جس مین مولٰنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی، اور ادبی نکات ہین، یہ درحقیقت مسلمانون کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم،

حصۂ اوّل، ضخامت ۳۴۹ صفحے، قیمت :- عہ ۱۲ر

حصۂ دوم، ضخامت ۲۷۱ صفحے، قیمت :- عہ ۱۲ر

موازنۂ انیس و دبیر (از مولانا شبلیؒ) اردو کے مشہور باکمال شاعر میرانیس کی شاعری پر ریویو، اردو مین فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ میرانیس کے بہترین مرثیون کا انتخاب، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو مین اپنے فن مین یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت، ۲۸۴ صفحے، قیمت سے ۳ر

کلیات شبلی اردو، مولٰنا کی تمام اردو نظمون کا مجموعہ جس مین مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسون مین پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی مذہبی، اور تاریخی نظمین، جو کانپور، ترکی، طرابلس بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی مین، یکجا ہین، یہ نظمین درحقیقت مسلمانون کے چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۲۰ صفحے، قیمت :- عہر

افاداتِ مہدی، ملک کے نامور انشاپرداز ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ وضمیمہ جات، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت ۓ، حجم ۲۷۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جس مین ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز مین بیان کی گئی ہے ۲ر کے ٹکٹ بھیجکر طلب کرین، (از مولٰنا ریاست [illegible])